

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

اونچی مہم

اشتیاق احمد

اٹلانٹس
پبلکیشنز

انٹرنیشنل پبلکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول	اونچی مہم
نمبر	انسپیکٹر جمشید سیریز نمبر 158
پبلشر	فاروق احمد

جملہ حقوق محفوظ ہیں

انٹرنیشنل پبلکیشنز کی تصدیق شدہ اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل، کسی قسم کی ذخیرہ کاری جہاں سے اسے دوبارہ ماحول کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں اور کسی بھی ذریعے سے ترسیل نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب اس شرط کے تحت فروخت کی گئی ہے کہ اس کو بغیر تاثر کی جعلی اجازت کے، طور تجارت یا بصورت دیگر مستعار دوبارہ فروخت نہیں کیا جائے گا۔

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

D-83 سائٹ - کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk

انٹرنیشنل
پبلکیشنز

ایک حدیث

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
”اللہ تعالیٰ تمہاری شکل و صورت اور مال کو نہ دیکھے گا،
بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو
دیکھے گا۔“

☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- ☆ یہ وقت عبادت کا تو نہیں۔
 - ☆ آپ کو اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
 - ☆ آپ نے کسی کو وقت تو دے نہیں رکھا۔
 - ☆ آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے عبادت اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔
- اشتیاق احمد

بوڑھا انسان

چند لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں کھڑے انہیں دیکھتے رہے، پھر انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری:

”خان رحمان، تمہاری زندگی میں جنگ و جدل کے مواقع پہلے بھی نہ جانے کتنی مرتبہ آچکے ہوں گے۔ اس موقع کے متعلق کیا خیال ہے، کیا ہم اس فوج کا مقابلہ کر سکیں گے، جب کہ ہم تعداد میں بالکل کم ہیں، ساز و سامان بھی پاس نہیں، صرف ایک پستول ہے یا پتھر، پھر تین طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور کمر کی طرف فرار کا راستہ بھی نہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟“

”جہاں تک مقابلے کا تعلق ہے، ہم کر سکتے ہیں، لیکن فتح کی امید نہیں رکھ سکتے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ہم شکست کھا جائیں گے اور شہادت کے جام نوش کر لیں گے، کیونکہ فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ان سے بات چیت کر کے معلوم کریں، یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟“ خان رحمان کی بجائے پروفیسر داؤد بول اٹھے۔

”شکریہ پروفیسر صاحب۔ خان رحمان، تم کیا کہتے ہو؟“

”وہی، جو میں ایسے موقعوں پر کہا کرتا ہوں۔ ہم مسلمان ہیں، ہر وقت موت کو خوش آمدید کہنے والے ہیں۔ موت کا کیا ہے، کسی وقت بھی آ سکتی ہے اور

دو باتیں

السلام علیکم!

آئیے، اس بار بالکل خشک باتیں کریں۔ تھوڑا سا گھی لے کر انہیں تر کر لیجیے گا، کیونکہ کبھی کبھی خشک باتیں بھی معدے کے لیے مفید ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں معدے کی فانی رطوبت کو خشک کر دیتی ہیں۔ اب آپ یہ نہ کہہ بیٹھیے گا، یہ حکمت کا پیر یڈ تو نہیں، یہ تو دو باتیں کا موقع ہے، لیکن کیا کیا جائے، آپ تو جانتے ہی ہیں، میں موقع محل دیکھنے کا عادی نہیں، نہ ہی آپ کے محبوب کردار دیکھتے ہیں۔ بس حالات کی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ حالات کی بھی انہیں تپا کر کندن بنا دے۔ ذرا دیکھیے تو حالات اس مرتبہ ان کے لیے کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ ارے ہاں، یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اونچی مہم، مجبورانی کے مجرم کا دوسرا حصہ ہے۔ کہیں پہلے اسے نہ پڑھنا شروع کر دیجیے گا۔ اوہو، یہ کیا بات ہوئی، میں تو چلا تھا خشک باتیں کرنے، وہ تو رہ ہی گئیں اور ادھر صفحے کا پیٹ تقریباً بھر گیا۔ خیر، خشک باتیں آئندہ پر اٹھا رکھیے، اس بار تر باتوں سے ہی کام چلا لیں۔ خشک باتوں کا کیا ہے، وہ تو میں کرتا ہی رہتا ہوں، شکریہ!

اشتیاق احمد

شہادت کی موت کا تو کہنا ہی کیا، پھر ڈرنا کیسا؟ کیوں نہ ہم ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے جانیں دے دیں۔“ خان رحمان بولے۔

”لیکن اگر جانیں بچانے کا امکان ہو تو حکم یہ ہے کہ جانیں بچائی جائیں، لہذا پہلے میں ان لوگوں سے بات کروں گا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

چند منٹ بعد دشمن فوج اس حد تک نزدیک آ گئی کہ بات چیت کا دروازہ کھولا جاسکتا تھا، چنانچہ انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے:

”ہمارے ملک میں تم لوگوں کی آمد قانون کے خلاف ہے۔ وضاحت کرو، تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم سب کو گرفتار کرنا اور گرفتار کر کے اپنے ملک لے جانا۔ وہاں ہم تمہیں اپنا قیدی بنا کر رکھیں گے۔“ دشمن کی طرف سے انگریزی میں جواب ملا۔

”کیا تم اس کا نتیجہ جانتے ہو، دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ سکتی ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے گویا دھمکی دی۔ اس بار وہ بھی انگریزی میں بولے تھے۔

”اس کا امکان نہیں۔ اول تو تمہارا ملک کمزور ہے، چھوٹا ہے، بڑی طاقت سے ٹکر لینا تمہارے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر تم لوگ ملک کے لیے اس قدر

اہم ہو بھی کہ تمہارا ملک تمہاری خاطر جنگ چھیڑ دے گا تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ تمہارے ملک کے لوگوں کو تو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی کہ تم لوگ کہاں ہو۔

تمہاری تلاش ملک بھر میں ہوتی رہے گی اور تم ہماری قید میں ہو گے۔ کیوں، کیسی رہی؟“

”آخر تم ہمیں قیدی کیوں ماننا چاہتے ہو؟“ خان رحمان جھنجھلا اٹھے۔

”اس لیے کہ تم اکبر بھورانی کا راز جان گئے ہو۔ تم نے یہ بات محسوس کر لی

ہے کہ اکبر بھورانی دراصل ہمارے ملک کا ایجنٹ ہے اور عملی طور پر اس قصبے میں ہماری حکومت ہے۔ ہمارا حکم چلتا ہے۔ اکبر بھورانی ہمارے اشاروں پر چلتا ہے، لیکن ہم نہیں چاہتے، یہ راز تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی معلوم ہو، لہذا یہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے ملک لے جائیں۔“

”اور اگر ہم جانے سے انکار کر دیں تو؟“ محمود نے چلا کر کہا۔

”تمہارے انکار کی بھلا کیا حیثیت ہے۔ تم ہمارے سامنے بالکل بے بس ہو۔ مقابلے کی صورت میں بھی یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے یا گرفتار ہو جاؤ گے۔ بہتر ہے، مقابلے کے بغیر ہی خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”اچھا تو کمانڈر صاحب، ہمارا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ خود کو دشمن کے حوالے اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ جسموں میں جان ہے اور ہاتھ پیر ہلانے کی سکت ہے۔“

”تو تم مقابلہ کرو گے؟“ طنز یہ لہجے میں کہا گیا۔

”بالکل، یہ بہت ضروری ہے۔“ خان رحمان مسکرائے۔

”تب تم لوگوں سے جنگی قیدیوں ایسا سلوک کیا جائے گا اور جنگی قیدیوں کے ساتھ ہمارے ملک میں بہت بھیا نک سلوک ہوتا ہے۔“

”بھئی واہ، بہت دن ہو گئے بھیا نک سلوک سے دو چار ہوئے۔ چلو اچھا ہے، موقع ملنے والا ہے۔“ فاروق بولا۔

”تو ہم تمہارے خلاف جنگ شروع کر رہے ہیں۔“

کمانڈر کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ان پر گولیوں کی باڑی ماری گئی، لیکن وہ ابھی گولیوں کی زد سے باہر تھے، تاہم فوراً نیچے لیٹ گئے اور جلدی جلدی پوزیشنیں لینے لگے۔

”کاش، ہم کیپٹن ارشاد سے چند رائفلیں اور کارتوس ہی لے لیتے۔“

خان رحمان بڑبڑائے۔

”اب ہمارے پاس صرف ایک پستول ہے اور باقی لوگ صرف پتھروں

سے کام لے سکتے ہیں۔“

”چلیے خیر، کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔“ فرزانہ بولی۔

انہوں نے پتھر اٹھا لیے اور پہلا حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جونہی ان کے خیال کے مطابق دشمن نزدیک آیا۔ انسپکٹر جمشید نے پہلا فائر کیا اور ان سب نے پتھر دشمن پر پھینکے، لیکن جواب میں ایک بھی چیخ نہ ابھری۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کم از کم انسپکٹر جمشید کی گولی کے جواب میں تو ایک چیخ ضرور ہی ابھرنی چاہیے تھی۔

”جمشید، کیا تمہارا نشانہ بھی چوک گیا ہے؟“

”نن، نہیں۔“ وہ بولے۔

”اباجان، آپ نے نہیں کے دو ٹکڑے جان بوجھ کر کیے ہیں یا آپ

ہکلائے ہیں؟“

”میں ہکلا یا تھا۔ میری گولی بالکل ٹھیک نشانے پر لگی تھی، لیکن اس نے دشمن کے سپاہی کا بال بھی بیکا نہیں کیا، جس کا مطلب ہے، یہ فوجی بلٹ پروف لباس میں ہیں، اسی لیے تو پتھر بھی بے کار گئے ہیں۔“

”اُف خدا، اب کیا ہوگا؟“ محمود نے کانپ کر کہا۔

”خان رحمان، محمود کے سوال کا جواب تم ہی دے سکتے ہو۔“

”میں ایک چھوٹی سی ہتھی فوج کا نہتہ کمانڈر ہوں۔ مقابلے میں سیکڑوں مسلح دشمن ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی جدید ترین ہے۔ یہ لوگ ان پہاڑیوں پر آتش گیر

بادہ پھینک کر انہیں آگ بھی دکھا سکتے ہیں۔ ان حالات میں میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم شہادت کی موت ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔“

”نہیں خان رحمان، یہ لوگ اتنے پاگل نہیں کہ ہمیں موت کے گھاٹ اتاریں، جب کہ انہیں ہماری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ ان حالات میں تو یہ بے خطر ہماری طرف بڑھتے چلے آئیں گے اور سیکڑوں رائفلوں کے مقابلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اباجان، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں خود کو ان فوجیوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔“

”ہاں، شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ ہم ان کی قید میں چلے جائیں۔“ انہوں نے کہا۔

”لیکن جمشید، یہ سوچ لو، ان لوگوں میں انسانیت نام کو بھی ہیں۔ رحم ان کے دلوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ یہ لوگ ہم پر انسانیت سوز مظالم توڑیں گے اور تم یہ بھی نہ بھولو کہ پروفیسر داؤد بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ کیا ہم ان پر قلم ٹوٹے دیکھ سکیں گے۔“

”نن، نہیں۔ لیکن خان رحمان، تم ہی بتاؤ، ہم مقابلہ کریں تو کس طرح۔ پتھر برسانے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”اباجان، آپ تھوڑی دیر پہلے کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ آپ نے یہ الفاظ کہے تھے، اُف خدا، دشمن فوج کے اس طرف سے..... آپ کیا کہنا چاہتے تھے اباجان؟“ فرزانہ بول اٹھی۔

”ہاں، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دشمن فوج کے اس طرف سے آنے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ملک سے لے کر اس قصبے تک کوئی خفیہ سُرنگ نکال رکھی ہے شاید۔ تبھی تو یہ اس طرف سے آگئے ہیں۔ سرحد کی طرف سے آتے تو

سبھی ادھر بھاگ رہے تھے تو کبھی ادھر۔ کتنی ہی چنگاریاں ان کے کپڑے چھلنی کر چکی تھیں۔

”بہت ستم ظریف دشمن ملا ہے اس مرتبہ۔“ انسپکٹر جمشید نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”ہاں، ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہٹنا رہا ہے۔“ خان رحمان نے منہ بنایا۔

”ارے، وہ نور دین موچی کہاں گیا؟“

”شاید وہ وہیں رہ گیا تھا۔ جب ہم اُٹھ کر بھاگے۔ اس نے خود کو فوج کے حوالے کر دیا ہوگا اور بعد میں انہیں بتا دیا ہوگا کہ وہ اکبر بھورانی کا خاص آدمی ہے۔“

”لیکن انہیں یقین کس طرح آیا ہوگا؟“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”نہیں آیا ہوگا تو بعد میں یقین دلا دے گا، جب وہ لوگ بھورانی سے تصدیق کریں گے۔“

ان کے ادھر ادھر آگ کی بارش ہوتی رہی۔ گولیاں بھی برستی رہیں اور وہ اونچی نیچی چٹانوں کے ذریعے خود کو آگے بڑھاتے رہے، لیکن کب تک۔ آخر بھاگنے کا سلسلہ ختم ہو گیا، دشمن ان کے سروں پر پہنچ گیا، ان کا گھیرا تنگ ہو گیا۔ رائفلیں ان کے سینوں کا نشانہ لینے لگیں۔ اب اگر وہ حرکت کرتے تو گولیاں انہیں چھلنی کر دیتیں۔ ایسے میں اسی کمانڈر کی آواز ابھری:

”بس انسپکٹر جمشید، اب کہاں تک بھاگو گے۔ تمہارے مقدر میں قید لکھی ہے۔ قید کا ثنا ہوگی یا پھر ان عمودی چٹانوں سے چھلانگیں لگا لگا کر جانیں دے دو۔ مقابلہ تو تم کر نہیں سکو گے، کیونکہ ہم سیکڑوں ہیں اور تم صرف چھ۔ چھ آدمی کب تک لڑو گے، آخر تھک جاؤ گے۔“ کمانڈر کی زہریلی آواز ان کے کانوں میں گھسٹی چلی گئی۔

جھڑپ ضرور ہوتی اور اس جھڑپ کو پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ان حالات میں کیپٹن ارشاد اس وقت ہماری مدد کو آچکا ہوتا، لیکن سرنگ والا خیال بھی درست ہے اور یہ لوگ چپ چاپ تھے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہیں، لیکن فرزانہ تم کیا کہتی ہو۔“

”یہ کہ کیوں نہ ہم اس سرنگ کے ذریعے ان کے ملک میں خود ہی داخل ہو جائیں۔ اس صورت میں شاید ہم بچاؤ کا کوئی راستہ تلاش کر لیں۔“

”ترکیب اچھی ہے، لیکن ہمیں سرنگ کا راستہ معلوم نہیں۔ نہ ہم اس سمت میں جاسکتے ہیں، جس سمت سے یہ فوج آئی ہے۔“ خان رحمان بولے۔

”لیکن ہم بلندی کی طرف بھاگ تو سکتے ہیں، آؤ چلیں۔“ انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے اور پھر جھکے جھکے بلندی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھیوں نے مجبوراً ان کا ساتھ دیا۔ اسی وقت نیچے سے آواز سنائی دی:

”ارے، تم لوگ کہاں جا رہے ہو، ادھر موت ہے۔ عمودی چٹانوں سے گر کر موت کو گلے لگا بیٹھو گے۔“

انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بس دوڑتے چلے گئے۔ اچانک انہیں اپنے سروں پر آگ کی بارش ہوتی محسوس ہوئی۔ آتش گیر مادہ پہاڑیوں پر اچھال کر فائر کیا گیا تھا اور انہیں آگ سے بچنے کے لیے رخ تبدیل کرنا پڑا۔

”شاید ہم زندگی میں اتنے بُرے کبھی نہ پھنسے ہوں گے۔“ خان رحمان بڑبڑائے۔

”پروفیسر انکل، آپ بالکل خاموش ہیں۔ کہیں ہم پر آپ کو غصہ تو نہیں آ رہا؟“ محمود نے ان کی طرف دیکھا۔

”کیوں بھلا غصہ کیوں آنے لگا۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟“ وہ مسکرائے۔

اور پھر ادھر بھی آگ کی بارش ہونے لگی۔ وہ خوف زدہ ہر نوں کی طرح

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں، ہاں
 بھی، اب کیا کریں۔ اور پھر سب سے پہلے انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔
 ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ، خود کو دشمنوں کے حوالے کر رہے ہیں، یہ جانتے
 ہوئے بھی کہ ان لوگوں سے کسی نرم سلوک کی قطعاً کوئی امید نہیں۔“ محمود نے بوکھلا کر
 کہا۔

”ہاں، جانتا ہوں، لیکن اسلام نے ہمیں خودکشی کی اجازت نہیں دی اور
 اس وقت خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کرنا خودکشی کے برابر ہوگا۔“ انہوں نے کہا۔
 ”ٹھیک کہتے ہو جمشید، یہ لو، میں بھی ہاتھ اٹھائے دے رہا ہوں۔“ خان
 رحمان بولے۔

”اب جب کہ تم دونوں گرفتار ہونے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو، میں بھی ہاتھ اٹھا
 رہا ہوں۔“ پروفیسر داؤد بچھے بچھے لہجے میں بولے۔
 ”اب ہم کیا کریں، ہم کیا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہاتھ اوپر
 اٹھا دیں۔“ محمود بے چارگی کے عالم میں بولا۔
 اور ان سب کے ہاتھ اوپر اٹھنے لگے۔ دشمن فوج کے سپاہی ان کی طرف
 بڑھنے لگے۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔
 ”خدا کو یہی منظور تھا اور خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی
 ہے۔“ پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

”ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ خان رحمان بولے۔

سپاہی نزدیک آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جھکڑیاں تھیں۔ انہوں نے
 اپنے ہاتھ جھکڑیاں پہننے کے لیے آگے بڑھا دیے۔ ان کے ملک کی سرزمین پر دشمن
 ملک کے فوجی انہیں جھکڑیاں پہنارہے تھے۔ یہ کچھ کم تکلیف دہ بات نہیں تھی۔

☆☆

جوں ہی ان کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈالی گئیں۔ دشمن سپاہی ایک ساتھ
 چلائے۔

”کامیابی مبارک کمانڈر۔“

”تم سب کو بھی مبارک ہو۔ ہماری مددوں کی آرزو آج پوری ہوگئی۔“
 کمانڈر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکے۔

”یہ سب ایک چال تھی، ایک منصوبہ تھا، تم لوگوں کو گرفتار کرنے کا۔“
 کمانڈر بولا۔

”ہم اب بھی نہیں سمجھے۔“

”اکبر بھورانی کو حکم دیا گیا تھا کہ کسی طرح انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو
 گرفتار کیا جائے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا۔ دارالحکومت میں جا کر
 منصوبے کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لیا۔ نیاز روڈ شاہی سٹریٹ کے دو مکان اس
 منصوبے کی تکمیل کے لیے بہت مناسب نظر آئے، پھر جملات کو حکم دیا گیا کہ
 اکبر بھورانی کے نام سے مکان نمبر ۱۱۱۶ شاہی سٹریٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے
 رہائش اختیار کرے۔ اس بے چارے کو ہمارے منصوبے کے بارے میں کچھ بھی
 معلوم نہیں تھا، چنانچہ اس نے جا کر رہائش اختیار کر لی، پھر عرفان غازی کو حکم دیا گیا کہ
 جا کر ۱۱۱۷ نمبر مکان میں رہائش اختیار کرے اور جملات کو سیڑھی کے ذریعے ہلاک
 کر دے۔ تمہیں فون کرتے وقت غبارے سے خرخراہٹ کی آواز نکالے، تاکہ
 انسپکٹر جمشید یہ خیال کرے کہ قتل عین اسی وقت ہوا ہے۔ جان بوجھ کر غبارہ دروازے پر
 پھینکا گیا۔ باورچی خانے میں لوہے کے پائپ چھپا دیے جائیں۔ پولیس انسپکٹر جو کہ

ہمارا خاص آدمی ہے، کو اشارہ دیا گیا۔ جب اسے موقع پر بلایا جائے تو اکبر بھورانی کی سنسنی خیز کہانی سنا دے۔ اس طرح انسپکٹر جمشید اس قصبے میں آنے پر مجبور ہو جائیں گے، چنانچہ ہر کام منصوبے کے مطابق ہوا جملات کو پہلے ہی یہ بات بتادی گئی تھی کہ ایک منصوبے کے تحت اسے جملات کے نام سے چار دھمکی آمیز خط ملیں گے، لیکن اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ ایک ڈراما ہوگا، لہذا وہ بے فکر رہا۔ یہاں تک کہ عرفان غازی کو اپنی آنکھوں سے سیڑھی کے ذریعے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا، لیکن چونکہ وہ اسے بخوبی جانتا تھا، اس لیے یہی سمجھا کہ یہ بھی اکبر بھورانی کے منصوبے کا ایک حصہ ہے اور واقعی وہ منصوبے کا ہی ایک حصہ تھا، چنانچہ دوسری طرف جا کر عرفان غازی نے نہایت اطمینان سے بے خبری کے عالم میں چاقو جملات کے جسم میں اتار دیا اور اسی راستے سے واپس آ کر سیڑھی اٹھالی، لوہے کے پائپ نکال کر باورچی خانے میں چھپا دیے۔ ہم جانتے تھے، انسپکٹر جمشید بہت جلد سراغ لگالیں گے اور قصبہ جالوم کا رخ کریں گے اور یہی ہم چاہتے تھے، پھر ہوٹل گلنار میں جو کچھ ہوا اور دوسری طرف انسپکٹر جمشید کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ سب ایک ڈراما تھا۔ ڈراما تھا تم لوگوں کو ان پہاڑیوں تک گھیر گھار کر لانے کا، تاکہ تمہیں گرفتار کر لیا جائے۔ اس سارے پروگرام میں اگر کوئی غلط بات ہوئی تو وہ تمہارے ملک کی فوج کی آمد۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسپکٹر جمشید فوج کا انتظام بھی کر کے آئیں گے۔ خیر، فوج جلد ہی واپس چلی گئی اور ہم پروگرام کے مطابق یہاں پہنچ گئے۔ تو جناب یہ تھی تفصیل۔“ یہاں تک کہہ کر کمانڈر خاموش ہو گیا۔

”تو یہ سارا منصوبہ صرف اور صرف ہمیں گرفتار کرنے کا تھا۔“ محمود چلا اٹھا۔

”ہاں بالکل۔“

”لیکن کیوں، تم لوگوں کو آخر اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ چلائے۔

”یہ تمہیں مسٹر ڈی سائٹ بتائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”اور یہ مسٹر ڈی سائٹ کون ہیں؟“ خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

”ڈی سائٹ ہمارے ملک کی ایک بہت اہم ہستی ہیں۔ خفیہ پولیس اور فون ان کی ماتحتی میں کام کرتی ہے۔ ان کے اختیارات بھی بے پناہ ہیں۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں کرے گا۔ ہمیں حکم ہے کہ جوں ہی تم لوگوں کو گرفتار کیا جائے، ان کے سامنے پہنچا دیا جائے۔“

”تو میرے خیال میں آپ ہمیں گرفتار کر ہی چکے ہیں یا ابھی کوئی کسر رہتی ہے۔ کیوں محمود، فرزانہ تم دونوں کا کیا خیال ہے؟“

”ایک تو تم فضول باتیں بہت کرنے لگے ہو۔“ فرزانہ تلملا کر بولی۔

”اور تم بلا ضرورت جلنے بھننے کی کوشش کرنے لگی ہو۔ کیوں محمود، ٹھیک ہے

تا۔“

”پپ، پتا نہیں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ اتنا لمبا چوڑا منصوبہ آخر کیوں بنایا گیا ہے؟“ محمود بڑبڑایا۔

”یہ شریف لوگ بتا تو چکے ہیں کہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے تھے۔“ فاروق

بولا۔

”کیوں؟“ محمود پر زور لہجے میں بولا۔

”اس کیوں کا جواب مسٹر ڈی سائٹ بتائیں گے۔ وہ بھی اس لیے بتائیں

گے کہ ان کے پاس بے پناہ اختیارات ہیں۔“ فرزانہ بول اٹھی۔

”ویسے تو انہیں اختیارات کو پناہ دینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ فاروق

منہ بنایا۔

”تو بہ ہے تم سے۔ دشمنوں کی قید میں پہنچ گئے اور پھر بھی چپک رہے ہو۔“

فرزانہ بھناٹھی۔

”تم لوگ بڑے شوق سے چپکتے رہو، لیکن ساتھ ساتھ قدم بھی اٹھاتے

رہو۔ ہمیں کافی چلنا ہوگا۔“ کمانڈر نے نرم آواز میں کہا۔

”چلیے جناب، آپ کے ڈی سائٹ سے ملنے کا اشتیاق تو ہمیں بھی پیدا

ہو گیا ہے۔“ فاروق بولا۔

”ویسے ان کا نام ڈی سائٹ کیوں ہے۔ بی یا جی سائٹ بھی تو ہو سکتا

تھا۔“ فرزانہ نے منہ بنایا۔

”میری بات ہے فرزانہ، کسی کے نام پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔“ محمود

نے گویا فصاحت کی۔

ان کا قافلہ چل پڑا۔ اب وہ نیچے اتر رہے تھے۔ آدھ گھنٹے تک چلتے رہنے

کے بعد وہ ایک سرنگ کے دہانے پر پہنچے۔ سرنگ کے دہانے پر دس فوجی رائفلیں لیے

موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر اٹن شن ہو گئے۔ سرنگ پہاڑوں کو تراش کر بنائی گئی تھی۔

اسے دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی۔ آگے چلتے ہوئے وہ اس میں داخل ہو گئے۔ ان

کے پیچھے تمام فوجی بھی سرنگ میں داخل ہو گئے۔ دس پہرے دار بھی اندر ہی آ گئے اور

اسی وقت کمانڈر نے نہ جانے کیا کیا کہ سرنگ کے دہانے پر ایک بڑا سا پتھر سرک آیا،

گویا اب سرنگ کا راستہ ر بند ہو گیا تھا اور شاید باہر سے سرنگ نظر بھی نہیں آ سکتی تھی۔

دہانہ بند ہوتے ہی اندر روشنی ہو گئی۔ سرنگ کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹنے لگی۔

ان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسی کسی سرنگ کی موجودگی کے بارے میں انہیں کچھ

معلوم نہیں تھا۔

اب ان کا سفر سرنگ میں شروع ہوا۔ انہیں نہ جانے کیوں چپ سی سوگھ گئی تھی۔ یہ خیال سب سے پہلے فاروق کو آیا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سرنگ کو دیکھ کر ہمیں سانپ سوگھ گیا ہو۔“ اس

نے پرسکون آواز میں کہا۔

”نہ صرف ہمیں، بلکہ ہمارے دشمنوں کو بھی۔“ محمود مسکرایا۔

”کیوں بھئی، کیا یہ سرنگ تم لوگوں کے لیے بھی نئی چیز ہے؟“ فرزانہ

بولی۔

”ہمارے لیے نئی کیوں ہوتی۔ اس کی تیاری میں برسوں لگے ہیں۔“

”تو کیا اس سرنگ کا دوسرا سرا تمہارے ملک تک چلا گیا ہے۔“

انسپکٹر جمشید بولے۔

”ہاں، دراصل یہ اسی لیے بنائی گئی ہے کہ ہم جب جی چاہے، تمہارے

ملک میں دخل اندازی کر سکیں۔“

”اچھا ہی ہوا، تم نے ہم لوگوں کو قید کر لیا۔“ خان رحمان بڑبڑائے۔

”وہ کیسے، بھلا تم لوگوں کے لیے کس طرح اچھا ہوا؟“ کمانڈر نے حیران

ہو کر کہا۔

”اب ہم اس سرنگ کو بند تو کر سکیں گے۔“ خان رحمان بولے۔

”ایسے سنہری خواب ابھی تمہیں نہ جانے کتنے دیکھنے ہیں۔“ کمانڈر طنز یہ

لہجہ میں مسکرایا۔

”خیر، دیکھا جائے گا۔“ انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

سرنگ میں انہیں تین گھنٹے تک چلنا پڑا۔ ان پر تھکاوٹ سوار ہونے لگی اور

پھر تین گھنٹے بعد کہیں جا کر انہیں سرنگ کا دوسرا دہانہ نظر آیا۔ یہ بند نہیں تھا۔ یہاں بھی

دس مسلح فوجی کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر سیدھے ہو گئے اور جب وہ سب باہر نکلے تو وہ بھی ان کے پیچھے باہر نکل آئے۔ کمانڈر نے یہاں بھی نہ جانے کیا کیا کہ وہاں بند ہو گیا۔ اب وہاں سرنگ کے کوئی آثار نہیں رہے تھے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ کوئی ایسا نشان ہی نظر آ جائے، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ سرنگ کا وہاں اس جگہ ہے، لیکن نظر نہیں آیا۔

”بس اب ان کی ہتھکڑیاں کھول دو۔ ان کی ضرورت نہیں رہی۔“ کمانڈر نے کہا اور ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ ایسے میں محمود نے ایک زوردار ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل دھڑام سے گرا۔

”سنجھل کر۔“ انسپکٹر جمشید گھبرا کر اس کی طرف بڑھے۔

”خبردار، کوئی غلط حرکت نہ کرنا، ورنہ انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

”اوہو، گرے ہوئے کہ اٹھانا غلط حرکت کس طرح کہلا سکتی ہے۔“

انسپکٹر جمشید بھناٹھے۔ ساتھ ہی انہوں نے محمود کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

”خیر تو ہے، تم ٹھیک تو ہو؟“

”جی، جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ ذرا چکر آ گیا تھا، شاید سرنگ کی بند ہوا

اثر ہو گیا ہے۔“

”بند ہوا، کیا کہہ رہے ہو۔ سرنگ تو ایر کنڈیشنڈ ہے۔“ کمانڈر نے ہنس کر

کہا۔

”اچھا، یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔“ محمود نے کہا۔

وہ پھر چلنے لگے۔ ایک بار مڑ کر دیکھا تو عمودی چٹانیں نظر آئیں: گویا وہ

اب ان چٹانوں کے دوسری طرف دشمن ملک میں پہنچ چکے تھے۔

”ابھی اور کتنا پیدل چلنا ہے مسٹر کمانڈر؟“

”پیدل سفر تو بس اب ختم ہونے کے قریب ہے۔ باقی ماندہ سفر ہم جیپوں پر طے کریں گے۔“

”تو ابھی اور بھی سفر باقی ہے۔“ فرزانہ نے منہ بنایا۔

”ہاں، مسٹر ڈی سائٹ تم لوگوں کا یہاں تو انتظار نہیں کر سکتے تھے۔“

”خیر بھی چلیے، اب ہم تمہارے قیدی ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں، جس قدر جی

چاہے پیدل چلا لو، کبھی ہمیں موقع ملا تو اس قدر پیدل چلائیں گے کہ رہے اللہ کا نام۔“

فاروق نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

”گویا تم بدلے میں ہمیں بھی قیدی بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ کمانڈر نے

مسکرا کر کہا۔

”اگر ایسا موقع ملا تو ضرور بنائیں گے۔ ویسے مسٹر کمانڈر، تمہارا نام کیا

ہے؟“

”غور بان۔“ اس نے بتایا۔

”غور بان، یہ کیا نام ہوا۔ کیا تم کوئی کام کرنے سے پہلے بہت غور کرنے

کے عادی ہو۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”یہ بات تو تم نے بالکل ٹھیک کہی، لیکن یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا، کیا

تم علم نجوم جانتے ہو؟“ کمانڈر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”علم نجوم تو نہیں، کالا علم ضرور جانتا ہوں اور اس کے مطابق یہ کہے دیتا

ہوں کہ موت تمہارے سر پر کھیل رہی ہے۔“ فاروق نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”نن، نہیں۔“ اس نے خوف زدہ ہو کر کہا اور جلدی سے سر کے اوپر دیکھا،

پھر ہنس کر بولا:

”کیوں مذاق کرتے ہو۔ میرے سر کے اوپر تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اب اتنا بھی جھوٹ نہ بولو مسٹر ساربان، تمہارے سر پر کم از کم آسمان تو ہے ہی۔“

”ساربان نہیں، غوربان۔“ اس نے بھنا کر کہا۔
”اوہ، مجھے افسوس ہے۔ میں بھول گیا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو اپنا نام اتنا عزیز ہے۔“ فاروق سہم گیا۔

”آئندہ میرا نام سوچ سمجھ کر لینا۔“ اس نے غرا کر کہا۔
”بہت بہتر مسٹر کار۔ نہیں ٹھہریے۔ پہلے سوچ اور سمجھ لوں، ہاں یاد آ گیا، بہت بہتر مسٹر غور..... بان۔“ اس نے نام کے دو حصے کیے۔ غوربان نے اسے گھور کر دیکھا۔

”نہی بات ہے فاروق، انہیں غصہ نہ دلاؤ۔ ہم ان کے قیدی ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ اور بھی بُرا سلوک کریں گے۔“ محمود نے گویا اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔
”اور بھی بُرا سلوک سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”مطلب یہ کہ بُرا سلوک تو یہ کریں گے ہی۔ تمہاری بدتمیزیوں کی وجہ سے بُرے سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ جائیں گے۔“
”تو تمہارے خیال میں میں بدتمیز ہوں۔“ فاروق نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

”ہاں، بالکل ہو۔“ محمود بولا۔
”کیا کہا، بالکل ہو۔ اچھا ٹھہرو، ابھی بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر فاروق محمود کی طرف جھپٹا۔

”ارے ارے، یہ کیا؟“ انسپکٹر جمشید بوکھلا اٹھے۔ فرزانہ بھی گھبرا کر آگے

بڑھی اور اپنے والد سے ٹکرا گئی۔ وہ زور سے گری اور لڑھکتی چلی گئی۔ پھر اٹھی اور چیخ کر بولی:

”فاروق، میں تمہیں مزا چکھا کر رہوں گی، تمہاری وجہ سے مجھے زبردست چوٹ آئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف دوڑی۔ اتنی دیر میں محمود خود کو پہچاننے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا تھا، گویا اب فاروق محمود کے پیچھے اور فرزانہ فاروق کے پیچھے بے تحاشا دوڑ رہے تھے اور انسپکٹر جمشید ارے ارے کہتے ان کے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔
”اوہو، کیا ہو گیا ہے تم لوگوں۔ کچھ تو خیال کرو۔ یہ لوگ کیا کہیں گے، یہ کیسے قیدی ہیں۔“ پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔ پھر خان رحمان کی طرف مڑے۔
”خان رحمان، تم ہی دوڑ کر انہیں پکڑو، یہ پاگل تو نہیں ہو گئے۔“
”اچھا۔“ انہوں نے کہا اور دوڑ لگا دی۔

”مسٹر غوربان، کہیں یہ لوگ کوئی چال تو نہیں چل رہے۔“ ایک فوجی نے کہا، لباس سے وہ غوربان کا نائب لگتا تھا۔

”چال چل کر بھی کیا کر لیں گے۔ اپنے ملک میں تو کچھ کر نہیں سکے، یہاں کیا کریں گے۔“ غوربان نے ہنس کر کہا اور دلچسپ نظروں سے اس دوڑ کو دیکھنے لگا۔ محمود کے گویا پر نکل آئے تھے، اڑا جا رہا تھا۔ فاروق بھی کچھ کم تیز نہیں تھا۔ ادھر فرزانہ پر دوڑنے کا بوت سوار ہو گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید ان سے کافی پیچھے رہ گئے تھے اور ایسا لگتا تھا، جیسے ان تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہوں۔ ادھر خان رحمان ان تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

”بوڑھے انسان، تم ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ تم دکھاؤ۔“

”مم، میں۔ یعنی کہ میں دوڑوں۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”ہاں، کیا تمہیں دوڑنا نہیں آتا؟“
”کچھ تو دوڑ ہی لوں گا۔“ وہ بے چارگی کے عالم میں بولے۔

”تو پھر دوڑو۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اگر تم نے انہیں چھو لیا تو انعام دوں

گا۔“

”اچھا۔“ انہوں نے کہا اور دوڑنے لگے۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ انعام کیا دو گے۔ مدت ہوئی، انہوں نے بھاگ دوڑ کا کام چھوڑ دیا تھا۔ لیکن انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ محمود اور فاروق نے دوڑنے کا سلسلہ بلاوجہ شروع نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کیا تھا، لہذا وہ جس قدر تیز دوڑ سکتے تھے، دوڑتے رہے۔ ان کے ساتھی اب ان سے بہت دور پہنچ چکے تھے، گویا وہ اپنے ساتھیوں اور دشمن فوج کے درمیان میں تھے۔

”دوڑو بوڑھے، دوڑو۔“ غوربان نے پر غرور لہجے میں کہا۔ وہ اور بھی تیز دوڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان سے بہت دور نکل آئے، لیکن محمود وغیرہ سے اب بھی بہت فاصلے پر تھے۔ اچانک انسپکٹر جمشید مڑے اور ان کی طرف دوڑنے لگے۔ پروفیسر داؤد بہت حیران ہوئے کہ انسپکٹر جمشید یہ کیا کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے یا کچھ کہہ سکتے، انسپکٹر جمشید ان کے نزدیک پہنچ گئے اور تیزی سے جھکتے ہوئے انہیں کندھے پر اٹھالیا، پھر اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بلا کی رفتار سے دوڑنے لگے۔

”جمشید، یہ کیا؟“

”محمود اور فاروق کام دکھا گئے پروفیسر صاحب، ہمیں فائدہ اٹھانا

چاہیے۔“

”لل، لیکن کیسے؟ جو نمی غوربان اوہ، سوری۔ غوربان کو احساس ہوا کہ ہم

چال چل گئے ہیں، وہ پوری فوج کو ہمارے تعاقب میں دوڑا دے گا اور مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلے میں بالکل نہتے ہیں۔“

”آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ دیکھیے، کھیتوں کا بہت طویل سلسلہ ایک بار ہم ان کھیتوں تک پہنچ گئے، پھر ان کے ہاتھ کہاں آئیں گے۔“

”اوہ۔“ پروفیسر داؤد کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں، وہ بولے۔

”جمشید، یہ تینوں حیرت انگیز ہیں، ان کا جواب نہیں۔ خدا کی قسم، ایسے بچے مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔“

انسپکٹر جمشید مسکرا کر رہ گئے۔ اگرچہ انہوں نے کندھے پر پروفیسر صاحب کو اٹھا رکھا تھا، پھر بھی اس قدر تیز دوڑ رہے تھے کہ جلد ہی خان رحمان تک پہنچ گئے اور اتنی دیر میں محمود کھیتوں کے سرے تک پہنچ چکا تھا۔

”ابا جان، کیا حکم ہے؟“

”بھئی، میں کیا حکم دوں گا۔ اس وقت تو اس فوج کی کمان تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ پھر پلٹ کر غوربان اور اس کی فوج کی طرف دیکھا۔ وہ سب کے سب اب بے تحاشا ان کی طرف دوڑ رہے تھے، کیونکہ ان کی چال اب ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

پھاڑی اُلو

”دُشمن نے دوڑ لگادی ہے۔ اب ہمارے لیے ٹھہرے رہنا مناسب نہیں،
لہذا آؤ۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید پروفیسر داؤد سمیت نیچے اتر گئے۔
”بھئی اب تو مجھے نیچے اتار دو۔“ انہوں نے کہا۔
”ابھی نہیں۔ کچھ دُور جا کر۔ یہ لوگ آتے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع
کردیں گے۔ ہمیں اس سے پہلے پہلے بہت دُور نکل جانا چاہیے۔ اتنی دُور اور مختلف
سمتوں میں کہ ان کی پہنچ سے باہر ہو جائیں۔“
”لیکن تم نے مجھے کندھے پر اٹھا رکھا ہے کھیت گنے کا ہے۔ اس طرح
ہماری اونچائی بڑھ جائے گی اور میرا سر گنوں سے اونچا ہو جائے گا۔ وہ لوگ دیکھ لیں
گے۔“

”جی نہیں، یہ گنے ہم سے بہت اونچے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ سب
باتیں میری نظر میں ہیں۔“
”اچھا بھائی، جیسے تمہاری مرضی۔“ انہوں نے بے چارگی کے عالم میں
کہا۔

وہ بے تحاشا دوڑتے چلے گئے۔ ساتھ ساتھ وہ سمت بھی تبدیل کرتے
جارہے تھے۔

”یار جمشید، یوں ہم کب تک بھاگتے رہیں گے۔“
”ابھی ہمیں بہت بھاگنا ہے، ورنہ ہم ان کے ہتھے چڑھ جائیں گے مشکل
یہ ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں اور ان لوگوں نے بلٹ پروف لباس پہن رکھا
ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”تو کیا ہوا باجان، ان میں سے چند ایک سے دست بدست جنگ تو لڑی
ہی جاسکتی ہے۔“ محمود نے چوٹک کر کہا۔

”اوہ ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب میں ایک چال چلوں گا۔ آؤ واپس
چلیں، لیکن ذرا چکر کاٹ کر۔“
”جی کیا مطلب؟“

”وہ سب لوگ اندھا دھند کھیتوں میں گھس پڑیں گے۔ شاید چند ایک
کھیتوں سے باہر رہ جائیں۔ ہم پہاڑوں والی سمت میں ہی کھیت کے کنارے کے
قریب چھپ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم اس قدر نزدیک
چھپے ہوں گے۔ وہ تو یہی سوچیں گے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اندر گھسنے کی کوشش کریں
گے۔“

”دیری گڈ، بہت شاندار ترکیب ہے۔“ خان رحمان خوش ہو کر بولے۔
”اور اس ترکیب پر عمل کر کے ہم واپس اس سرنگ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔“
فاروق بولا۔

”ہاں، اس کا بھی امکان ہے، لیکن سرنگ کا دہانہ کس طرح کھولیں گے۔
ہمیں تو یہ تک معلوم نہیں کہ.....“

خان رحمان کے لفظ درمیان میں رہ گئے۔ انہوں نے دوڑتے قدموں کی
آوازیں سُنی تھیں۔ وہ دُوبک گئے، سانس روک لیے۔ بے شمار دوڑتے قدم ان سے

کافی فاصلے پر گزرتے چلے گئے۔ اب وہ پھر حرکت میں آئے اور اس کنارے کی طرف بڑھنے لگے، جس سے کھیت میں داخل ہوئے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ کنارے کے نزدیک پہنچ گئے اور گنوں کے درمیان سے انہیں میدانی علاقہ کسی قدر نظر آنے لگا۔

”پہلے صرف میں کنارے تک جاؤں گا، پھر تم لوگ آؤ گے۔ اگر خطرہ ہوا تو میں خاموشی سے واپس پلٹ آؤں گا، ورنہ تم لوگوں کو اشارہ کر دوں گا۔“ انہوں نے دہلی آواز میں کہا۔

”لیکن ابا جان، آپ اشارہ کس طرح کریں گے۔ الو کی آواز تو یہاں مناسب نہیں رہے گی۔“ فرزانہ نے اعتراض کیا۔

”کیوں، کیا تمہارے خیال میں پہاڑی علاقے میں الو نہیں ہو سکتے، بھی پہاڑی الو بھی تو ہوتے ہوں گے، جیسے پہاڑی طوطے۔“ فاروق منمنایا۔

”اچھا بھائی ہوتے ہوں گے پہاڑی الو بھی، لیکن اگر اس طرف کچھ دشمن موجود ہیں تو وہ الو کی آواز سن کر چونک سکتے ہیں۔“ فرزانہ نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اچھا خیر، میں خود آ کر تمہیں حالات سے باخبر کروں گا۔ فکر نہ کرو۔“

انہوں نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ پانچوں وہیں جم کر رہ گئے۔ سورج اب سر پر تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ سرے کے نزدیک آ کر رک گئے۔ اب وہ سینے کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ پوری احتیاط کرتے ہوئے انہوں نے سر کنارے سے باہر نکال ہی لیا۔

دس کے قریب فوجی چوکس کھڑے تھے، لیکن ان کی نظریں کھیتوں کے اوپر ہی اوپر چاروں طرف طواف کر رہی تھیں۔ شاید وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کے قیدی کہاں ہیں۔ انسپکٹر جمشید نہایت خاموشی سے واپس مڑے اور اپنے ساتھیوں

کے پاس پہنچے۔

”وہاں دس دشمن موجود ہیں۔“ انہوں نے سرگوشی کی۔

”تب تو ان سے نبٹا جاسکتا ہے۔“ خان رحمان بولے۔

”ہاں، لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“

”پرو فیسر داؤد بولے۔

”ہم ان سے ہاتھوں اور پیروں سے لڑیں گے۔ اس کے سوا اب کوئی

صورت نہیں۔ آؤ چلیں، اب خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہ کام نہایت خاموشی سے انجام دیا جائے۔ شور مچا نہیں اور تمام کے تمام دشمن کنارے کی طرف اٹنے نہیں۔“ خان رحمان نے کہا۔

”تب پھر ان پر جا پڑنے کا پروگرام مناسب نہیں رہے گا۔“ فرزانہ نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”لیجیے، اب کوئی پھڑکتی ترکیب سننے کے لیے تیار ہو جائیے۔“ فاروق نے طنز بھری آواز میں منہ سے نکالی۔

”خاموش، ان کے کانوں تک اگر ہم میں سے کسی کی سرگوشی پہنچ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے دہلی آواز میں کہا۔

”ہاں فرزانہ، جلدی کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”کیوں نہ ہم ان میں سے ایک ایک کو کھیتوں کے اندر کھینچنے کی کوشش کریں۔“

”اوہ ہاں، بہت خوب فرزانہ۔ یہ وہ ترکیب ہے، جس سے سانپ بھی مرجائے گا اور لاش بھی نہیں ٹوٹے گی۔“ انسپکٹر جمشید نے پُر جوش آواز میں کہا۔

”لیکن ابا جان، فرزانہ نے ابھی ترکیب کہاں بتائی ہے۔“ فاروق نے

حیران ہو کر کہا۔

”عقل کے ناخن لو۔ گھاس تو نہیں چر گئے۔“ محمود بھناٹھا۔

”ہم اس وقت گئے کے کھیت میں ہیں، گھاس کے نہیں۔“

”دھت تیرے کی، گھاس کے بھی کوئی کھیت ہوتے ہیں۔“ محمود نے بھنا

کر ران پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی، لیکن فرزانہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ روک لیا۔

”بس بس، ران پر ہاتھ لگنے کی آواز دشمنوں تک جاسکتی ہے۔“

”اوہ، شکریہ۔ بروقت خبردار کیا۔“ محمود بولا۔

”میرا خیال ہے، ہم وقت ضائع کرنے پر قتل گئے ہیں۔“ پروفیسر داؤد

نے تنک آ کر کہا۔

”ہاں، آپ کا خیال بھی ٹھیک ہے۔ اچھا تو پھر آئیے کنارے کی طرف۔

اب ہم ان کا شکار کھیلیں گے، جس طرح مچھلی کا شکار کھیلا جاتا ہے۔“ انہوں نے کہا اور

کنارے کی طرف چل پڑے۔ پانچوں نے ان کا ساتھ دیا۔ کنارے کے قریب پہنچ

کر انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک گنا پکڑ کر

بلا دیا، پھر سانس روک لیا۔ وہ سب سینے کے بل لیٹے ہوئے تھے۔

”ادھر کوئی حرکت ہوئی ہے۔“ ایک فوجی کی آواز سنائی دی۔

”جا کر دیکھو، وہ لوگ نہتے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ سنگین

لگی رائل تہمارے پاس ہے۔“ دوسری آواز سنائی دی۔

”اچھا۔“ پہلے نے کہا اور پھر وہ کھیت میں داخل ہوتا نظر آیا۔ وہ چاروں

طرف دیکھ رہا تھا اور رائل دونوں ہاتھوں میں چھتیاں ہوئے چلا آ رہا تھا۔ اچانک

اس کی رائل پر ایک ہاتھ پڑا۔ ساتھ ہی اسے آگے کی طرف دھکا لگا اور وہ منہ کے بل

گرا۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید اسے چھاپ بیٹھے۔ رائل کھینچنے کا کام خان رحمان

نے کیا تھا۔ اب انسپکٹر جمشید کے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر جمے ہوئے تھے اور گلا

دباتے ہی انہوں نے جان لیا تھا کہ کم از کم گلے پر ہلٹ پروف لباس نہیں ہے، چنانچہ

وہ دباؤ ڈالتے چلے گئے۔ فوجی کے منہ سے ہلکی سی آواز تک نہ نکل سکی اور نہ وہ سر زمین

سے اوپر اٹھا سکا۔ آخر اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس پر بھی انہوں نے اسے نہ

چھوڑا۔ وہ تو اس وقت الگ بٹے جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ دوسری دنیا کا رخ

کر چکا ہے۔

”خان رحمان، جلدی سے اس کا لباس پہن لو۔ ہلٹ پروف لباس کی ہمیں

بہت ضرورت ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ ابھی اور بھی آئیں گے۔ اپنے ساتھی کی خبر لینے کے لیے

انہیں آنا ہی ہوگا۔“ خان رحمان نے مسکرا کر کہا اور جلدی جلدی فوجی کا لباس پہننے

لگے۔ ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ کنارے کی طرف سے آواز آئی:

”ارے، یہ ڈنکاف کہاں رہ گیا۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔ دُور نہ نکل گیا

ہو۔“

”ہوشیار، دوسرا شکار آ رہا ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اب فکر کی ضرورت نہیں۔ میں ہلٹ پروف لباس پہن چکا ہوں۔“ خان

رحمان بولے۔

وہ تیار ہو گئے۔ دوسرا فوجی بہت احتیاط سے ان کے قریب پہنچا۔ خان

رحمان نے اس کی کمر پر چھلاگ لگائی اور اسے ساتھ لیے زمین پر آ رہے۔ ساتھ ہی

انسپکٹر جمشید نے اس سے رائل چھین لی۔

”بے فکر ہو جمشید، اس کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔“ خان رحمان

بولے اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر دبا دیے۔ تین منٹ بعد وہ بھی

مردہ پڑا تھا اور پروفیسر داؤد اس کا لباس پہن رہے تھے۔

”ہائیں، یہ ڈنکاف کے ساتھ روڈن بھی کھیت میں ہی رہ گیا۔ یہ لوگ اندر کیا کر رہے ہیں۔ ٹھہرو، میں ان کی خبر لیتا ہوں۔“ تیسری آواز آئی اور وہ ایک بار پھر چوکس ہو گئے۔

تیسرا شکار جوں ہی ان کی زد پر آیا، خان رحمان نے اس کی کمر پر ایک زور دار ٹکر ماری۔ وہ دھڑام سے گرا اور اس مرتبہ گئے بہت زور سے ہلے۔ فوراً ہی آواز گونجی:

”ہائیں، یار اندر تم لڑو تو نہیں پڑے آپس میں۔“

دشمن نے اچانک پلٹا کھایا اور خان رحمان کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑادی۔ وہ زور سے گرے اور اگر اس وقت انسپکٹر جمشید حرکت میں نہ آ جاتے تو خان رحمان ضرور زخمی ہو گئے تھے، کیونکہ اس دشمن کے جوتے کے نیچے کیل لگے ہوئے تھے اور اس نے جوتے کا نچلا حصہ ان کے منہ پر مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن ان کی ٹانگ درمیان میں ہی رک گئی۔ انسپکٹر جمشید نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا۔ عین اسی وقت ایک آواز ابھری:

”اندر ضرور گڑ بڑ ہے، آؤ دیکھیں۔“

اب خطرہ بڑھ گیا۔ دیر کرنا مناسب نہیں تھا، لہذا انسپکٹر جمشید نے ایک بھرپور ہاتھ دشمن کی ناک پر جمادیا۔ اس کے منہ سے ایک بھیا نک چیخ نکل گئی اور دوسری طرف الٹ گیا۔ ساتھ ہی باہر سے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ وہ فوراً لیٹ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے دو تین بھرپور ٹھوکریں اس کے اور رسید کیں اور پھر جلدی سے اس کا بلٹ پروف لباس اتار لیا۔ ابھی پہن ہی پائے تھے کہ سات آدمی ان سب پر ٹوٹ پڑے۔ اب گئے کے کھیت میں خونریز جنگ ہونے لگی۔ رائفلیں اب لاشیوں کی

طرح استعمال ہونے لگیں۔ گولی چلانے کا موقع اب نکل چکا تھا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نازک پوزیشن میں تھے، کیونکہ ان کے جسموں پر بلٹ پروف لباس نہیں تھے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتے۔ انہوں نے جھکائی پر جھکائی دینے کا کام شروع کر دیا اور دشمنوں کو چکر پر چکر دینے لگے۔ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کے ہاتھ بجلی ایسی تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے، ان کے باقی ساتھیوں کے اس طرف متوجہ ہونے سے پہلے پہلے ان لوگوں سے فارغ ہو جائیں۔ انہوں نے دو آدمیوں کو تو آن کی آن میں زمین دکھا دی۔ تین کو محمود، فاروق اور فرزانہ الجھائے ہوئے تھے۔ باقی دو ان کے مقابل سنگینیں لے آئے اور ان کے ذریعے سے حملے شروع کر دیے۔ انسپکٹر جمشید نے ایک کوچہ دیا۔ سنگین ان کے سینے سے ایک انچ کے فاصلے سے نکل گئی۔ ساتھ ہی دشمن کے سر پر ان کا دھپ زور سے لگا اور وہ گر پڑا۔ ساتھ ہی انہوں نے دائیں ہاتھ میں پکڑی رائفل کا کندہ اس کے سر پر دے مارا۔ خان رحمان اور دوسرے دشمن کے درمیان رائفلیں باقاعدہ لاشی کی طرح چل رہی تھیں، وہ انہی پر وار روک رہے تھے اور انہی سے حملہ کر رہے تھے۔ اچانک ان کی رائفل کی سنگین دشمن کی گردن کو چھوتی گزر گئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا تو محمود مردانہ وار ایک دشمن کی سنگین کے وار خالی دے رہا تھا۔ فاروق ایک دائرے میں چکر لگا کر دشمن کو تھکا رہا تھا۔ فرزانہ غپے پر غپے دے رہی تھی۔ دونوں ان کی مدد کو آگے بڑھے اور پانچ منٹ بعد میدان ان کے ہاتھ تھا۔

”اب تم لوگ بھی جلدی جلدی بلٹ پروف لباس پہن لو۔“ وہ بولے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ تیزی سے اس کام میں مصروف ہو گئے، اب ان کے پاس رائفلیں بھی تھیں اور لباس بھی بلٹ پروف تھے، لہذا پہلے کا نسبت وہ بہت بہتر پوزیشن میں تھے۔

”اب کیا پروگرام ہے ابا جان؟“

”ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو ہم یہیں سے پلٹ جائیں اور اس سرنگ کو تلاش کریں، یعنی اس کا دہانہ کھولنے کی کوشش کریں یا پھر کسی طرح غوربان کو گرفتار کر کے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہمیں گھیر کر یہاں کیوں لایا گیا ہے۔“

انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔
”دوسرا پروگرام بہت خطرناک ہے، لہذا میں تو یہی کہوں گا کہ ہمیں نکل ہی چلنا چاہیے۔“ خان رحمان بولے۔

”میں بھی خان رحمان کی تائید کرتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے۔ ان حالات میں یہی غنیمت ہے کہ ہم یہاں سے بچ کر نکل جائیں، آؤ چلیں۔“

انہوں نے کھیت کے کنارے کا رخ کیا ہی تھا کہ بے شمار دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

”شاید وہ لوگ واپس آ گئے۔“ انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

”پھر تو ہم سرنگ کی طرف نہیں جاسکیں گے۔“ خان رحمان بولے۔

”ہوں، خیر دیکھتے ہیں۔ اب ہم اتنے غیر محفوظ نہیں ہیں۔“

وہ کنارے سے نزدیک ہو گئے۔ انہوں نے فوجیوں کو دوڑ کر کھیتوں سے باہر نکلنے دیکھا اور پھر وہ سرنگ کی طرف دوڑنے لگے۔

”حیرت ہے، انہیں ہو کیا گیا ہے؟“ پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

”جی کچھ بھی نہیں، بس ذرا عقل آ گئی ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”عقل آ گئی ہے، وہ کیسے؟“

”اچانک یہ خیال آ گیا کہ ہم نے یہ چکر سرنگ تک پہنچنے کے لیے چلایا

ہے اور ہونہ ہو، وہ کھیتوں میں تلاش ہی کرتے رہ جائیں اور ہم لوگ سرنگ تک پہنچ جائیں۔ بس اس خیال کے آتے ہی یہ لوگ ادھر دوڑ پڑے اور یہ خیال ضرور اس غوربان صاحب کو آیا ہوگا، کیونکہ وہی ان کا کمانڈر ہے۔ یوں بھی شاید بہت غور کرنے کا عادی ہے۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”تب تو اسے ذرا جلدی عقل آ گئی۔ کاش آدھ گھنٹے بعد آتی۔ اتنی دیر میں ہم سرنگ تک پہنچ گئے ہوتے۔“ فاروق بولا۔

”لیکن صرف سرنگ تک پہنچنا کوئی کام نہیں، پہنچنا تو دراصل سرنگ کے اندر ہے اور اس کے لیے پہلے اسے کھولنے کا طریقہ معلوم کرنا ہوگا۔“ محمود نے کہا۔
”بھئی جب تک سرنگ کے دہانے تک نہیں پہنچیں گے، اس وقت تک کھولنے کا طریقہ کس طرح معلوم کر سکیں گے۔“ فرزانہ جل کر بولی۔

”تو اس میں جلنے یا بھسنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ کوئی سردی تو پڑ نہیں رہی۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”افسوس، اب ہم سرنگ کا رخ نہیں کر سکتے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”تو پھر چلیے۔ ذرا شہر کی سیر کر آئیں۔ مسٹر ڈی سائٹ سے مل آئیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی، وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ دیے ان سے ملاقات رہے گی دلچسپ۔“ فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

”اس سے زیادہ احمقانہ تجویز اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو خود ہی موت کے منہ میں جانے والی بات ہوگی۔“ فرزانہ نے اسے گھورا۔

”کچھ بھی ہو، رہے گا ایڈ ونچر۔“ محمود بولا۔

”اس وقت کیا ہم کچھ کم ایڈ ونچر سے دوچار ہیں۔“ فرزانہ نے منہ بنایا۔

”خیر تو ہے، آج تم کچھ کام چوری نظر آ رہی ہو۔“ فاروق نے حیران ہو کر

کہا۔

”ڈی سائٹ ہمیں اپنا قیدی دیکھنا چاہتا ہے، کیوں دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اس کے قریب جانا گویا اس کی خواہش پوری کرنے کے برابر ہوگا۔ ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔ اگر گرفتار ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو شوق سے چلے جاؤ۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”کیا خیال ہے، ابا جان؟“

”بھئی بات دراصل یہ ہے کہ ہم اب سرنگ کی طرف تو جانیں سکتے۔ ظاہر ہے، مخالف سمت میں ہی جائیں گے۔ زیادہ دیر ان کھیتوں میں بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ جلد ہی وہ بڑے پیمانے پر کھیتوں کو کھگانا شروع کر دیں گے اور ان کی ناکہ بندی بھی کر دی جائے گی۔ اس وقت ہم خود کو بے بس محسوس کریں گے۔ لہذا کیوں نہ ہم اس وقت سے پہلے ہی کھیتوں سے نکل جائیں۔“ انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

”بالکل ٹھیک، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔“ خان رحمان بولے۔

”تو پھر چلیے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس بار دشمن ملک کی سیر ہی

کسی۔“ محمود نے کہا۔

وہ تیزی سے مخالف سمت میں چل پڑے۔ غور بان اور اس کے ساتھی سرنگ تک پہنچنے کی افراتفری میں کھیتوں پر توجہ نہیں دے رہے تھے۔ یوں بھی ان کے اپنے ساتھیوں کی وجہ سے گئے کے کھیتوں میں مل چل مچی ہوئی تھی۔

اچانک انہوں نے ہیلی کاپٹروں کی آوازیں سنیں۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ اوپر نگاہ کی تو چار ہیلی کاپٹر چلے آ رہے تھے۔

”تو یہ لوگ اسی لیے کھیتوں سے نکل رہے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید فکر مند

ہو گئے۔

”جی کیا مطلب؟ کس لیے نکل رہے ہیں؟“

”ہیلی کاپٹر کھیتوں پر یا تو فائرنگ کریں گے یا پھر دھوئیں کے بم ماریں گے، تاکہ ہم بوکھلا کر باہر نکل آئیں۔“

”ادو۔“ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

”تب پھر کیا کیا جائے؟“

”بس جس قدر تیز چلنا ممکن ہے، چلو۔ اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہیلی کاپٹروں سے اگر فائرنگ شروع ہو جائے تو سینے کے بل لیٹ جانا اور اگر دھوئیں کے بم مارے جائیں تو پھر بے ہوش ہو جانا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”جی کیا فرمایا، بے ہوش ہو جانا۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں، بوکھلا کر کھیتوں سے باہر نکل آنے کا مطلب گرفتاری کے سوا کچھ نہیں ہوگا، لیکن اگر ہم کھیتوں کے اندر ہی بے ہوش ہو گئے تو شاید دشمن ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

اسی وقت گولیوں کی تڑاڑ شروع ہوئی۔ ہیلی کاپٹر ایک سرے سے شروع ہو گئے تھے اور کھیتوں کے دوسرے سرے کی طرف چلے جا رہے تھے، لیکن وہ اس سمت میں نہیں تھے۔ ہیلی کاپٹر شمالاً جنوباً فائرنگ کرتے تو اس صورت میں انہیں گولیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہذا وہ اطمینان سے چلتے رہے۔ اچانک فرزانہ بولی۔

”ابا جان، انہوں نے اپنے رخ تبدیل کر لیے ہیں۔“

”تو پھر سینے کے بل لیٹ جاؤ، اللہ ہی ہمارے حفاظت کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

وہ کیلی زمین پر لیٹ گئے اور خدا کو یاد کرنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ ہیلی کاپٹروں

کی آواز تیز ہوتی چلی گئی اور پھر سیڑیوں گولیاں گنوں کو توڑتی چلی گئیں۔ ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے بے شمار گولیاں زمین میں دھنس گئیں۔ ایک گولی تو پروفیسر داؤد کے سر کے بالوں کو چھوتے ہوئے زمین میں دھنس گئی۔

”ارے باپ رے، میں تو بال بال بچا۔“

”بے سدھ لیٹے رہیے، حرکت کرنا خطرناک ہوگا۔“

ہیلی کاپٹر گزر گئے، لیکن ایک منٹ بعد ہی ان کی واپسی شروع ہو گئی۔

”وہ۔ وہ پھر آ رہے ہیں۔“

”ہاں، وہ پھر آ رہے ہیں۔ نہ جانے ابھی وہ کتنی مرتبہ آئیں گے۔ اب

جوں ہی وہ ہمارے سروں پر سے گزر کر دوسری طرف جائیں، آگے کی طرف سرکنا

شروع کر دینا۔ ہمیں جلد از جلد کنارے تک پہنچنا چاہیے۔ کہیں گولیوں کے بعد

دھوئیں کے بھونکے کی باری نہ آ جائے۔“ خان رحمان بولے۔

ہیلی کاپٹروں کے گزرتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ سینے کے

بل ریٹنگ کے وہ تو عادی تھے، لیکن پروفیسر داؤد کے لیے یہ کافی مشکل کام تھا، تاہم

مرتے کیا نہ کرتے، کسی نہ کسی طرح وہ ان کا ساتھ دے ہی رہے تھے، میدان سے تو

انسپکٹر جمشید انہیں اپنے کندھے پر اٹھا لائے تھے۔ اس جگہ وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اسی وقت ہیلی کاپٹر پھر آتے دکھائی دیے اور ایک بار پھر وہ ساکت

ہو گئے۔ کھیت کا کنارہ اب زیادہ دور نہیں رہا تھا اور انہیں دوسری طرف کا منظر کسی قدر

نظر آنے لگا تھا۔ انہوں نے دیکھا، دوسری طرف ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ شاید یہ

کسان کا تھا۔ اس وقت یہ مکان ہی ان کے لیے جائے پناہ ہو سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر پھر گولیاں برساتے گزر گئے، لیکن اس بار ان کی گولیاں کافی

فاصلے پر گری تھیں۔ واپس بھی وہ اسی فاصلے سے ہوئے، لہذا اس بار انہیں گولیوں کا

سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جوں ہی وہ سروں پر سے گزرے۔ انہوں نے پھر آگے بڑھنا

شروع کیا اور پھر وہ کنارے تک پہنچ گئے۔ مکان صرف ان سے دس گز دور تھا۔ ادھر

کوئی نہیں تھا۔ یعنی غور بان کا کوئی فوجی یہاں موجود نہیں تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی اس

جگہ ختم ہو گیا تھا۔ جس قدر بھی کھیت تھے، ان کی کمر پر تھے، عین اسی وقت کھیتوں سے

دھواں اٹھنے لگا۔ ساتھ ہی دھماکوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ اس کے ساتھ بے شمار

گاڑیوں کی آواز سنائی دی۔ ان کے بریک چرچانے لگے۔ گاڑیاں ان کے بالکل

قریب آ کر رُک رہی تھیں۔

”لو بھئی، پھنس گئے۔ اب یہ لوگ کھیتوں کو چاروں طرف سے گھیر لیں

گے۔“ خان رحمان بولے۔

”ہوں، لیکن اگر ہم کسی طرح ایک جیب حاصل کرنے میں کامیاب

ہو جاتے ہیں تو پھر بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ محمود نے خیال ظاہر کیا۔

”طلب یہ کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح اس مکان تک پہنچ جانا چاہیے۔ اس کے

بعد ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں اور اب مزید وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ اب جو لوگ آئے

ہیں، اس وقت ہدایات لینے میں مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی پوری توجہ کھیتوں

کی طرف ہو جائے گی، لہذا یہی وقت ہے کچھ کر گزرنے کا، لہذا میں چلا۔“ یہ کہتے ہی

”دینے کے بل ریٹنگ ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ ان

سب کو ایک ایک کر کے گزرتا تھا۔ اب وہ کھیت کے کنارے پر موجود تھے اور نئے

آنے والے فوجیوں کو دیکھ سکتے تھے۔ ان کی کمر دوسری طرف تھی اور ان سے صرف

بیس بائیس گز کے فاصلے پر انسپکٹر جمشید ریگ رہے تھے۔ انہوں نے دم سادھ لیے

سانس سینے میں اٹکنے لگے اور پھر انسپکٹر جمشید مکان کے اندر داخل ہو گئے۔

”پروفیسر اٹکل، اب آپ کی باری ہے۔“ فاروق نے سرگوشی کی۔

”مم، میری۔ ارے باپ رے، اگر انہوں نے لٹ کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔“ انہوں نے کانپ کر کہا۔
 ”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ فوراً ہاتھ اوپر اٹھا دیجیے گا۔ اس صورت میں یہ فائر نہیں کریں گے۔“

”لیکن اس طرح میں ان کی قید میں تو چلا جاؤں گا۔“ انہوں نے کانپ کر کہا اور مسکرا دیے۔

”تو کیا ہوا انکل، آپ کو تو معلوم ہی ہے، ابا جان کھیت سے نکلے، چکے ہیں۔ اب وہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئیں گے اور جوں ہی انہیں معلوم ہوا، آپ کو گرفتار کر لیا گیا ہے، وہ ہر قیمت پر آپ کو ان سے چھڑالیں گے۔“

”میں جانتا ہوں، جمشید کی صدا میتوں سے بخوبی واقف ہوں، لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”دیکھیے انکل، یہ ڈرتو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ خدا کے لیے جلدی کیجیے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے کہا اور ریچکتے ہوئے کھیت سے نکل گئے۔

ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ انہیں زیادہ فکر پروفسر داؤد کا ہی تھا۔ اب تو وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئے تھے کہ کاش، پروفسر صاحب کو اس مہم پر ساتھ نہ لائے ہوتے، لیکن اس وقت کے معلوم تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے۔ وہ تو اپنے ملک کے ایک قصبے میں ایک قاتل کا سراغ لگانے آئے تھے۔

پروفیسر داؤد نے تقریباً نصف راستہ طے کر لیا۔ عین اسی وقت فوجی اس جگہ سے منتشر ہونے لگے۔ پروفسر داؤد کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہوں نے رفتار تیز کر دی۔ یہ دیکھ کر ان لوگوں کی جان میں جان آئی کہ فوجی کھیتوں کے مختلف کناروں کا

رخ کر رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے یہ نیچے نہیں دیکھا تھا اور اسی وقت پروفسر داؤد مکان کے دروازے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے آؤدیکھانہ تاؤ، اندر گھس گئے۔

اب وہ دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ کھیت کے کنارے سے نکلنا اب آسان نہیں رہا تھا، کیونکہ اب کھیت کے دونوں کناروں پر فوجی موجود تھے اور چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ حیرت تو یہ تھی کہ ابھی تک انہوں نے اس مکان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ انہیں تو سب سے پہلے اس مکان کو دیکھنا چاہتے تھا۔ اچانک فوجیوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوسری طرف چلے گئے۔ اب وہ انہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

”میدان صاف ہے انکل، اب کون جائے۔“ فاروق بولا۔

”چلو، تم ہی بسم اللہ کرو۔“ خان رحمان بولے۔

”جی بہتر، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ اس نے کہا اور کھیت سے سے نکل گیا۔

”میدان میں رکے بغیر وہ مکان تک پہنچ گیا۔ فوجی نہ جانے کدھر نکل گئے تھے۔ اس کے بعد فرزانہ کی باری آئی۔ اسے بھی کوئی خطرہ پیش نہ آیا، پھر محمود گیا۔ آخر میں خان رحمان نے کھیت سے سر باہر نکالا۔ میدان اب بھی صاف تھا، لہذا وہ بھی روانہ ہوئے جب بھی کوئی مکان میں داخل ہوتا تھا۔ دروازہ فوراً اندر سے بند کر دیا جاتا رہا تھا۔ اس وقت بھی دروازہ بند تھا۔ انہوں نے اسے دھکیلا اور اندر داخل ہو گئے۔ فوراً ہی ان کے سر پر کوئی وزنی چیز زور سے لگی اور ان کی آنکھوں کے آگے تاریے تارے ناچ گئے، پھر گہری تاریکی چھا گئی۔“

اصلی چینیں

”شروع سے آخر تک کا ڈراما بہت ہی خوب رہا۔ نہایت کامیاب رہا۔ یہ لوگ ہمارے جال میں ایسے پھنسے کہ پھنسنے چلے گئے، بس ایک بات غلط ہوئی اور وہ یہ کہ ڈرامے کا ہیرو ان کی وجہ سے مارا گیا، لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ عرفان غازی کونسا ہمارے اپنے ملک کا تھا۔ وہ ہمارا ایجنٹ تھا، لیکن تھا تو مسلمان اور مسلمانوں کے مرنے پر ہمیں کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں حیران ہوں، انسپکٹر جمشید اور اس کے بچے اس قدر مشہور کیوں ہیں، ان میں ایسی کوئی صلاحیت ہے، جس کی بنا پر انہوں نے بڑے بڑے مجرموں کو شکست دی ہے۔ کہیں یہ سب قصے کہانیاں تو نہیں۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، شاید ان لوگوں کو بہت بڑھا چڑھا کر مشہور کیا گیا ہے، تا کہ لوگ دور سے ہی ان سے خوف کھائیں، کیونکہ میں نے تو ان پر اس قدر آسانی سے قابو پالیا ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے گھر کے چوہوں پر قابو پالیتا ہے اور اب یہ بھیگی بلیوں کی طرح بے ہوش پڑے ہیں۔ سام لٹ، میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ ان کے سروں پر اس قدر زور سے چوٹیں مارنا کہ یہ مجھ سے بات کرنے کے بھی قابل نہ رہ جائیں۔“ اس سے پہلے لہجہ خوش گوار رہا تھا۔ یہ جملہ ناخوش گوار لہجے میں کہا گیا۔

”اب مجھے کیا معلوم تھا سر کہ یہ لوگ اس قدر کمزور ثابت ہوں گے۔ اپنی طرف سے تو میں نے اب بھی بہت رعایت کی ہے۔ بہت ہلکی پھلکی چوٹیں ماری

ہیں۔“ ایک اور آواز ابھری۔

”خیر کوئی بات نہیں، ڈاکٹر ورنٹام کو فون کرو۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“

”او کے سر۔“ سام لٹ نے کہا اور پھر فون کا ڈائل گھومنے کی آواز سنائی دی۔

یہ الفاظ ان سب نے بخوبی سنے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ ہوش میں آ گئے تھے، لیکن جان بوجھ کر بے سدھ پڑے رہے تھے۔ اور اب ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ کھیتوں کے سرے پر وہ مکان بھی دشمنوں کے جال کا ایک حصہ تھا۔ وہ اس میں پہلے سے موجود تھے، گویا ڈی سائٹ نے ان کے ساتھ ملی چوہے کا کھیل کھیلا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر فاروق کا خون کھولنے لگا، لیکن خون کو کھولانے کا بھلا کیا فائدہ تھا۔ کن اکھیوں سے انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں اپنے والد بے حس و حرکت پڑے نظر آئے، گویا ابھی وہ بے ہوش ہی پڑے رہنا چاہتے تھے۔

”ان لوگوں کے لیے بھی کمرے میں کرسیاں لے آؤ۔ یہ ہمارے معزز قیدی ہیں۔“ ڈی سائٹ کی آواز ابھری۔

”او کے سر۔“

اور پھر کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کرسیاں رکھی جانے لگیں۔ آخر سام لٹ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ڈاکٹر آ گئے ہیں سر۔“

”ٹھیک ہے، انہیں اندر لے آؤ۔“ ڈی سائٹ نے کہا۔

وہ ابھی تک ڈی سائٹ کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ دیکھتے بھی کیسے، وہ تو بے ہوش پڑے تھے۔ دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہو گئے۔

”ڈاکٹر، ان لوگوں کو جلد از جلد ہوش میں لانا ہے۔“
 ”یہ بے ہوش کس طرح ہوئے سر۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔
 ”آپ اس بے وقوف سام لٹ کو دیکھ رہے ہیں نا۔ اس نے ان کے سروں پر ڈنڈے برسا دیے ہیں۔“
 ”اوہ اچھا، فکر نہ کیجیے۔ یہ ابھی ہوش میں آ جائیں گے۔“
 اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے ایک زوردار چیونٹک ماری اور آنکھیں کھول دیں، پھر بوکھلا کر اٹھے اور چونک کر بولے۔
 ”یہ۔ یہ کیا۔ ہم کہاں ہیں؟“
 ”انسپکٹر جمشید ہوش میں آؤ۔ تم اس وقت مسٹر ڈی سائٹ کے سامنے موجود ہو۔“ سام لٹ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔
 ”اوہ۔“ وہ چونک کر پہلے سام لٹ کی طرف مڑے، پھر اس لمبے آدمی کی طرف جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ڈی سائٹ ہے۔
 ”تو تم ڈی سائٹ ہو۔“ انہوں نے جھلائے ہوئے انسان کے لہجے میں کہا۔ یہ ایک بہت لمبا آدمی تھا، تھا بھی بہت صحت مند۔
 ”ہاں، میں ڈی سائٹ ہوں۔ کیا تمہیں مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟“
 ”تم، تم چاہتے کیا ہو۔ ہمیں یہاں کیوں پکڑا لیا ہے۔ ہم سے تمہیں کیا دشمنی ہے؟“
 ”گھبراؤ نہیں، ابھی تمہارے تمام سوالات کے جواب دوں گا۔“ ڈاکٹر پہلے اس کے ساتھیوں کو ہوش میں لائیے۔
 ”بہت بہتر سر۔ میں انکیشن تیار کرتا ہوں۔ انسپکٹر جمشید کو ہوش میں آتے دیکھ کر میں یہ خیال کر بیٹھا تھا کہ باقی لوگ بھی بس ہوش میں آنے والے ہی ہیں۔“

”اوہ ہاں، یہ کیا مشکل ہے۔ ٹھہریے، میں دیکھتا ہوں۔“
 یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید ان پر جھک پڑے اور انہیں باری باری جھنجھوڑنے لگے۔
 ”اٹھو بھئی، کب تک سوتے رہو گے۔ اوہو نہیں، یہ سوکب رہے ہیں، یہ تو بے ہوش ہیں۔ ہاں تو اٹھو بھئی، کب تک بے ہوش رہو گے۔ اتنا بے ہوش رہتا بھی درست نہیں۔“
 انہیں ہنسی آ گئی، لیکن وہ اس ہنسی کو چہروں پر نہ لاسکے۔ اندر ہی اندر مسکرا کر رہ گئے۔ انسپکٹر جمشید دراصل اس وقت ایک حواس باختہ انسان کا کردار ادا کر رہے تھے۔
 آخر انہوں نے ایک ایک کر کے آنکھیں کھول دیں۔ خان رحمان بڑبڑانے کے انداز میں بولے:
 ”ہم۔ ہم کہاں ہیں جمشید؟“
 ”دشمن کی قید میں، ادھر دیکھو، یہ مسٹر ڈی سائٹ ہیں۔“
 ”ارے اچھا، بہت شوق تھا ان سے ملنے کا۔“ یہ کہہ کر وہ پرجوش انداز میں ڈی سائٹ کی طرف لپکے اور خوش ہو کر بولے:
 ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی جناب، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی خوشی بھی ہو سکتی ہے۔“
 ”تم کون ہو؟“ ڈی سائٹ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔
 چہرے پر نفرت کے آثار تھے۔
 ”مم، میں کون ہوں جمشید؟“ وہ ان کی طرف مڑے۔
 ”خان رحمان ہو، میرے بہترین دوست۔“

”ہوں۔“ ڈی سائٹ نے کہا اور ان کی طرف گھورا۔ اب اس کی آنکھیں
انکارا بن گئی تھیں۔

”کیوں، کیا تم انپکٹر جمشید ہو؟“

”اس میں کیا شک ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔“

”بالکل ہیں۔“ وہ بولے۔

”اور یہ دونوں کون ہیں؟“ اس نے خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی طرف
دیکھا۔

”یہ میرے بہت ہی قریبی دوست ہیں۔“

”ہوں، ٹھہرو۔ پہلے میں اکبر بھورانی سے بات کر لوں۔ جب تک یہ
اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ لوگ اصلی انپکٹر جمشید وغیرہ ہی ہیں، اس وقت تک میں کوئی
قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔“

”ہم سو فیصد اصلی ہیں جناب، ابھی ہمارے ملک میں انسانوں
میں ملاوٹ شروع نہیں ہوئی۔“ فاروق نے کہا۔

اس نے جیسے فاروق کا جملہ سنا ہی نہیں۔ فون پر نمبر گھماتا رہا۔ جلد ہی سلسلہ
مُل گیا اور اس نے کہا:

”ہیلو بھورانی، بھئی یہ کیا چکر ہے۔ جن لوگوں کو تم نے غوربان کے حوالے
کیا ہے، وہ تو اصلی انپکٹر جمشید لگتے ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے
لگا، پھر بولا:

”پھر بھی تم تصدیق کر لو۔ کیا یہ لوگ اس وقت دارالحکومت میں موجود
نہیں ہاں..... میں انتظار کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور انہیں

”یہ۔ یہ غوربان کہیں غلط آدمیوں کو تو نہیں پکڑ لایا۔“ ڈی سائٹ نے
بوکھلا کر کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اتنے حواس باختہ لوگ انپکٹر جمشید اور اس
کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔“ سام لٹ نے جلدی سے کہا۔

”غوربان کو بلاؤ۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔“

”بالکل ٹھیک۔ وہ ہے بھی اسی قابل۔“ فاروق نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

”کس قابل؟“ فرزانہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”کھال کھینچنے جانے کے قابل۔ دیکھا نہیں تھا، ہمیں کس طرح بھیڑ

بکریوں کی طرح پکڑ لایا ہے۔“

”ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔“

اسی وقت غوربان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی

تھیں۔

”غوربان، بدتمیز، یہ تم کن لوگوں کو پکڑ لائے ہو؟“

”انپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو سر، انہی لوگوں کے بارے میں آپ کی
ہدایات تھیں اور مسٹر اکبر بھورانی نے اس سلسلے میں ہماری ہر طرح مدد کی۔ انہی کے
منصوبے کے تحت تو یہ لوگ قصبہ جالوم تک پہنچے ہیں۔“

”مجھے پوری تفصیل سناؤ۔ میرا خیال ہے، یہ لوگ جمشید اور اس کے بچے
نہیں ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟“

”میں نے کہا ہے، تفصیل سناؤ۔“ ڈی سائٹ نے غرا کر کہا۔ غوربان
کانپ اٹھا اور جلدی جلدی تفصیل سننے لگا۔ آخر خاموش ہو گیا۔

گھورنے لگا۔
 ”آپ یقین کریں جناب، ہم بالکل اصلی ہیں، لیکن ذرا یہ تو بتائیں، آپ ہم سے چاہتے کیا ہیں؟“

”تمہارا چار ڈالوں گا۔“ اس نے منہ بنایا۔

”تب ہمارے اصلی یا نقلی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ فاروق بولا۔
 ”تم لوگ اتنی آسانی سے میرے قابو میں آ جاؤ گے، میں سوچ بھی نہیں

سکتا تھا۔“

”بات دراصل یہ ہے جناب کہ بعض اوقات ہم جان بوجھ کر بھی دشمنوں کے قابو میں آ جاتے ہیں۔“ فاروق بولا۔

”وہ کیوں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس ہمیں بڑے بڑے دشمنوں سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے، ہر وقت بڑے بڑے مجرموں سے ملاقات ہوتی رہے۔“ فاروق نے جواب دیا۔
 ”مہربانی کر کے تم خاموش ہی رہو، تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر

ہیں۔“

”آپ کی ہی نہیں، اور بھی بہت سے لوگوں کی سمجھ میں باہر ہیں۔“ فرزانہ

نے لقمہ دیا۔

”جی ہاں، ان بہت سے لوگوں میں یہ خود بھی شامل ہے۔“

”ہم نے مانا، ہم بہت آسانی سے آپ کے قبضے میں آ گئے۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ ہم آپ لوگوں کی چالوں کو سمجھ نہیں سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کیا کیوں کیا، آپ کو ہماری ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟“ انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”میرے ملک کے سربراہ کا حکم یہی تھا کہ تم لوگوں کو اپنے یہاں قیدی رکھا

جائے۔“ اس نے کہا۔

”آپ کے ملک کے سربراہ کا حکم۔“ انسپکٹر جمشید نے مارے حیرت کے

کہا۔

”ہاں، دراصل وہ تمہارے ملک میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کچھ کام لینا چاہتے ہیں، لیکن اس قسم کے کاموں کے ماہرین نے انہیں بتایا کہ اس ملک میں ایسے کام اس وقت تک آسانی سے نہیں کیے جاسکتے، جب تک انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو ملک سے باہر نہ نکال لیا جائے، چنانچہ انہوں نے مجھے حکم دیا۔ اس قسم کے کاموں کا ماہر مجھے سمجھا جاتا ہے۔ میں نے فوراً اکبر بھورانی سے رابطہ قائم کیا۔ اکبر بھورانی قصبہ جالوم یا پھر دوسرے لفظوں میں تمہارے ملک میں ہمارا پچیس سال پرانا ایجنٹ یہ اور اس وقت تک خاص مقام حاصل کر چکا ہے۔ میں نے اس سے رابطہ قائم کیا۔ اور اپنا منصوبہ اسے بتایا۔ منصوبے کی تمام تفصیلات میں پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ اکبر بھورانی کو تو بس ہدایات کے مطابق عمل کرنا تھا، چنانچہ اس نے عمل کیا اور نتیجے کے طور پر تم لوگ یہاں موجود ہو۔“

”لیکن تمہارے ملک کے صدر ہمارے ملک میں کیا کام کرنا چاہتے

ہیں۔“

”یہ ان کا معاملہ ہے۔ ہم آپس میں ایسی باتیں نہ پوچھتے ہیں نہ بتاتے ہیں۔ ہر معاملہ راز رکھا جاتا ہے۔ یہ معاملہ بھی راز ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں، بہر حال میں تو بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اب وہ بڑی آزادی سے اپنے کام کر سکتے ہیں۔ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔“

”غلط خیال ہے جناب۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”کیا مطلب، غلط خیال ہے۔ وہ کس طرح؟“

”آپ فکر نہ کریں جناب، ہم خود ہی چلے جائیں گے۔“ فاروق نے خوش

ہو کر کہا۔

”تم، تم کس طرح چلے جاؤ گے؟“ اس نے چونک کر کہا۔

”اسی سرنگ کے ذریعے، جس سے ہمیں لایا گیا ہے۔“

”تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ شاید تم بھول گئے۔ تمہیں کھیتوں کے

کنارے واقع مکان سے بے ہوش حالت میں یہاں تک لایا گیا ہے۔ تم کیا جانو کہ وہ کھیت اور مکان کس طرف ہیں۔“

”ہم تلاش کر لیں گے انہیں، آپ فکر نہ کریں، بس ہمیں اجازت دے

دیں۔“ فاروق نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی سائٹ نے ریسیور اٹھایا اور بولا:

”ہیلو، ڈی سائٹ بول رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر دوسری طرف کی بات سننے لگا،

پھر بولا:

”تو تم نے پوری طرح اطمینان کر لیا ہے؟“

آخر اس نے ریسیور رکھا اور انہیں بغور گھورتے ہوئے بولا:

”اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ تم لوگ واقعی انسپکٹر جمشید پارٹی ہو۔ اس

میں اب کوئی شک نہیں رہا، لہذا اب میں پھر حیران ہوں کہ تم کیسے انسپکٹر جمشید ہو اور

کیسی تمہاری پارٹی ہے۔ تم تو میرے جال میں چوہوں کی طرح پھنس گئے۔“

”بس جی، عقلیں گھاس چرنے چلی گئی تھیں، جب عرفان غازی کا فون

ملا۔“ فاروق نے مسکسی صورت بنائی۔

”انسپکٹر جمشید، تمہارا یہ بیڑا بہت بولتا ہے۔“ اس نے منہ بتایا۔

”اس سے یہ شکایت ہمیں بھی ہے۔“ فرانہ نے چپک کر کہا۔

”ہمارے ملک میں صرف ہم ہی تو نہیں ہیں۔ ہم جیسے کچھ اور لوگ بھی

ہیں، وہ راستے کے پتھر ثابت ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔

کچھ اور محبت وطن لوگ بھی ہیں، جو وطن کی خاطر ہر آن قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔

ان دنوں چند بھائیوں کا نام بھی سننے میں آ رہا ہے۔ سنا ہے، وہ شوکی برادران کہلاتے تھے

ہیں۔“

”شوکی برادران، یہ نام میرے لیے نیا ہے۔ ہاں انسپکٹر کامران مرزا اور

ان کے بچوں کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا، لیکن چونکہ فی الحال صدر صاحب

تمہارے ملک کے مغربی حصے میں دخل اندازی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کو

چھپڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہاں، انہوں نے ادھر آ کر دخل اندازی کی تو

ان سے بھی نبٹ لیا جائے گا۔“

”تو آپ کو یہ معلوم نہیں کہ صدر صاحب کیا کام لینا چاہتے ہیں۔“

”نہیں، اور نہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو بس اپنے کام سے کام رکھا

کرنا ہوں اور فی الحال میرا کام یہ ہے کہ تم لوگوں کو اپنی قید میں رکھوں۔“

”صلیے جناب، پھر رکھیں قید میں۔ اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔“ فاروق نے

منہ بتایا۔

”ابھی تمہارے بارے میں تصدیق نہیں ہو سکی۔ میں بے کار لوگوں کو اپنی

قید میں نہیں رکھ سکتا۔ ہاں، اگر یہ معلوم ہو گیا کہ تم واقعی انسپکٹر جمشید پارٹی ہو تو پھر ضرور

میں تم لوگوں کو قید میں ڈال دوں گا۔“

”اور اگر یہ بات ثابت نہ ہوئی تو آپ کیا کریں گے۔“

”اس صورت میں تم لوگوں کو ملک کی نام جیل میں بھجوا دوں گا۔ اب تمہیں

واپس تمہارے ملک بھجوانے کا انتظام کون کرے۔“

بوللا۔ غوربان نے اسے گھور کر دیکھا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

وہ دین سے نکلے تو معلوم ہوا، دین ایک عمارت کے اندر روکی گئی تھی۔ اس عمارت کے چاروں طرف کوٹھڑیاں تھیں اور ان کے اندر قیدی تھے۔ یہ قیدی سلاخوں سے لگے انہیں گھور رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے کہا:

”وہ آگئے نئے شکار۔ اب نئی چیخیں سننے کو ملیں گی۔ بھی واہ، کچھ تو سننے کو ملے گا۔“

”کیا مطلب؟“ انسپکٹر جمشید چونکے۔

”تم لوگوں کے لیے وہ سامنے والی کوٹھڑی ہے۔ چپ چاپ اس میں چلے جائیے۔ رہا چیخوں کا معاملہ، میں مسٹر ڈی سائٹ سے اجازت لے لوں، پھر تمہاری چیخیں بھی سنادی جائیں گی ان لوگوں کو۔“ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ گاڑی جس دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی، وہ لوہے کا تھا اور گاڑی کے اندر داخل ہونے کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ صرف غوربان اور اس کے چھ ماتحت اندر آئے تھے۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید آگے بڑھے۔ انداز ایسا تھا، جیسے کوٹھڑی کی طرف جانا چاہتے ہوں، لیکن اچانک وہ ایڑی پر گھوم گئے اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے محمود کے چاقو کی نوک غوربان کی گدی پر رکھ دی۔ ان کی سرد آواز جیل کے احاطے میں گونجی:

”ایک انتہائی تیز ترین چاقو اس وقت تمہاری گردن پر ہے میرا ہاتھ چلنے کی دیر ہے، تمہاری گردن کٹ کر دور جا کرے گی۔ بہتر یہی ہے کہ دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دو اور جو کچھ میں کہوں گا، اس پر عمل کرو۔ تمہارے ساتھی بھی ہاتھ اٹھا دیں۔“

غوربان کا چہرہ ست گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اس کے ساتھ اس کے ساتھیوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے۔

”خیر، تم سے ملاقات بہت پھس پھسی رہی۔ میں سمجھتا تھا، کچھ خاص قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ بھی غوربان انہیں لے جاؤ۔ اور خاص جیل میں ڈال دو۔ ان کے لیے تو تم ہی کافی ہو۔“

”شکریہ سر، چلو بھی۔“ غوربان نے کہا۔

”تو کیا ان کے ساتھ میں بھی نہ جاؤں؟“ سام لٹ بولا۔

”نہیں، کیا ضرورت ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی

ضرورت نہیں۔ غوربان، انہیں لے جاؤ۔“

”جی بہتر۔“

اور وہ بجھے بجھے سے غوربان کے ساتھ باہر نکل آئے۔ یہاں ملٹری کی بند وین تیار کھڑی تھی۔ انہیں دین کے پچھلے حصے میں بٹھایا گیا۔ جلد ہی دین روانہ ہو گئی۔

”اباجان، یہ تو ہماری بہت بے عزتی ہو گئی۔“ فرزانہ منہ بنا کر بولی۔

”یہ بے عزتی میں نے خود ہی کرائی ہے۔“ انہوں نے دبی آواز میں کہا۔

”جی کیا مطلب، خود ہی کرائی تھی، لیکن کیوں؟“

”ابھی کچھ نہ پوچھو۔ اس دین میں کچھ بتانا مناسب نہیں، اور ہاں۔ محمود،

ذرا اپنا چاقو دینا۔“

”تو کیا، آپ کام شروع کرنے لگے ہیں؟“

”دین کا تالا کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کھل گیا تو کیا ہی بات ہے۔“

محمود نے چاقو نکال کر انہیں دے دیا اور وہ تالے کے سوراخ پر جٹ گئے۔

لیکن کچھ نہ بنا۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی رک گئی اور پچھلا دروازہ کھلا۔

”نیچے اتر آؤ۔“

”بہت بہتر مسٹر غوردان..... سوری بان۔“ فاروق جلدی سے

”تم حماقت کا ثبوت دے رہے ہو۔ اس احاطے سے باہر نہیں نکل سکو گے۔“ غور بان غرایا۔

”خاموش رہو، میں نے تمہیں بولنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر اب زبان ہلائی تو چاقو کم از کم ایک انچ گردن میں اتار دوں گا۔“ انسپکٹر جمشید دہلی آواز میں غرائے غور بان نے ہونٹ بھیج لیے۔

”اب تم لوگ ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لو۔“

وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھے اور ان کے اسلحے اور دوسری چیزوں پر قبضہ کر لیا، پھر چند قدم پیچھے ہٹ آئے اور رائفلیں ان کی طرف تان دیں۔ اسی وقت ایک قیدی زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ اس نے خوش ہو کر کہا:

”بھئی واہ، اب سنائی دیں گی چیخیں، اصلی چیخیں۔“

تلاشی لینے پر چابیوں کا ایک گچھا بھی ملا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے فرزانہ سے

کہا۔

”اس کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو، جس میں یہ ہمیں بند کرنے والے تھے۔“

”جی بہتر۔“ اس نے کہا اور چابیاں لے کر کوٹھڑی کے دروازے پر چلی

گئی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔

”باقی لوگ یہیں ٹھہریں گے۔ صرف میں اور غور بان اس کوٹھڑی کے اندر

جائیں گے۔ چلو غور بان۔“

”آپ کا پروگرام کیا ہے ابا جان؟“ محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

”ابھی کچھ نہ پوچھو۔ وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔“

یہ کہہ کر وہ غور بان کو چاقو کی نوک کے ذریعے آگے دھکیل لے گئے۔

کوٹھڑی کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا۔ پورے پندرہ منٹ بعد

دروازہ کھلا اور اس میں سے غور بان باہر نکلا اس کے پیچھے انسپکٹر جمشید نظر نہیں آئے۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئے خان رحمان نے پریشان ہو کر اس کی طرف رائفل تان دی:

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خان رحمان، یہ میں ہوں۔“ انہوں نے انسپکٹر جمشید کی آواز سنی۔

”ارے، لیکن آپ نے غور بان کا میک اپ کس طرح کر لیا؟“

”میں میک اپ کا واجبی سامان لے کر آیا تھا۔ یہ سامان میری کمر کے گرد

ایک پٹی سے بندھا ہوا تھا۔ اس وقت وہی کام آیا ہے۔ اب ان لوگوں کو بھی اسی

کوٹھڑی میں لے جاؤ۔ ایک ایک کو لے جاؤ اور باندھ باندھ کر ڈالتے رہو۔ کلن کے

منہ میں رومال ٹھونستانہ بھولنا، ورنہ یہ شور مچائیں گے، جب کہ میں یہ چاہتا ہوں، باہر

اس تبدیلی کا علم کسی کو نہ ہو۔“

”جی بہت بہتر۔“ محمود نے ہر جوش لہجے میں کہا۔

اس کام میں پندرہ منٹ اور صرف ہوئے۔ اس کے بعد وہ صحن میں

کھڑے نظر آئے۔ میک اپ صرف انسپکٹر جمشید ہی کر سکتے تھے۔ باقیوں کے جسموں

پر پہلے ہی دشمن فوجیوں کے لباس تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ڈھیلے ڈھالے لباسوں

میں بہت عجیب سے لگ رہے تھے۔

”اب میں اس قید خانے کے قیدیوں سے دو دو باتیں کر لوں۔“

یہ کہہ کر وہ ایک کوٹھڑی کے دروازے پر جا کر کھڑے ہوئے اور بولے:

”آپ لوگ آزاد ہونا پسند کریں گے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، ہم تو ان لوگوں کی چیخیں بھی سنتا پسند کریں گے۔“ ایک قیدی بولا۔

”ہم تم لوگوں کو اس قید خانے سے نکالنے کی ذمہ داری لیتے ہیں، لیکن تم

وہ وین میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا، پھر لوہے کے دروازے پر دھپ کرنے ہی لگے تھے کہ ایک خیال آنے پر رک گئے اور قیدیوں کی ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔

”کیوں بھئی، دروازہ کھولنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟“
 ”تین بار انگلی سے کھٹ کھٹ کریں، چوتھی بار دھپ رسید کریں۔“
 ”اوہ۔ خدا کا شکر ہے، مجھ سے غلطی ہونے لگی تھی۔“ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ تین بار انگلی سے کھٹ کھٹ کی اور پھر دھپ رسید کر کے وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

دروازہ فوراً ہی کھلا اور وین بیک ہوتی باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر رک گئی اور انسپکٹر جشید غور بان کی آواز میں بولے:

”اندر جن لوگوں کو قید کیا گیا ہے، وہ انتہائی چالاک اور حد درجے خطرناک ہیں اور مسٹر ڈی سائٹ کے خاص قیدی ہیں، لہذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آج رات اور صبح قیدیوں کو کچھ کھانے پینے کو نہ دیا جائے، کیونکہ دروازہ کھولنا خطرناک ہوگا۔ مطلب یہ کہ ابھی قیدی بھوکے رکھے جائیں۔ اس حکم پر سختی سے عمل کیا جائے۔“
 ”لیکن سر، یہ سر پھرے لوگ تو چلا چلا کر ناک میں دم کر دیں گے۔“ ایک نگران نے پریشان ہو کر کہا۔

”یہ منہ سے آواز بھی نہیں نکالیں گے۔ میں نے اس کی ترکیب کر لی ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی وین آگے بڑھ گئی۔

”اب کہاں کا ارادہ ہے ابا جان؟“ اندرونی دیوار والے سوراخ میں سے محمود نے پوچھا۔

”ڈراڈی سائٹ سے ملیں گے۔“ وہ بولے۔

لوگوں کو میری ایک بات ماننا ہوگی۔“
 ”اور وہ کیا؟“ کئی قیدی پر شوق لہجے میں بولے۔
 ”یہ کہ آج رات اور صبح تم لوگوں کو کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ اگر محافظ کھانا اندر لائے تو انہیں اس تہدیلی کا علم ہو جائے گا، جو ہم یہاں لا چکے ہیں۔“
 ”بات تو ٹھیک ہے، لیکن کھانا اور ناشتا تو نگران بہر حال لائیں گے۔“
 ”نہیں لائیں گے، جب میں انہیں حکم دے دوں گا تو پھر کس طرح لائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، ہم آزادی کے لیے ایک دن کیا، کئی دن بھوکے رہ لیں گے۔“

”کیا تم سب لوگ اسی ملک کے ہو؟“
 ”نہیں، اس قید خانے میں ملکی آدمی ایک بھی نہیں ہے۔ سب کے سب غیر ملکی ہیں۔“ ایک بولا۔

”تو پھر صبر سے انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے، ہم رات میں ہی کسی وقت لوٹ آئیں، ورنہ پھر صبح تک تو ضرور آئیں گے اور تم سب کو آزاد کرالے جائیں گے۔ ہم ملک سے باہر نکلنے کا راستہ بھی تمہیں بتائیں گے۔ تم سب اپنے اپنے ملک جاسکو گے۔“
 ”فکر نہ کرو۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

”چلو بھئی، تم لوگ وین کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاؤ۔ میں دروازہ بند کر دوں گا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔ تم لوگ ہر صورت حال کے لیے پوری طرح تیار رہنا۔ ایسا نہ ہو، ہم ان قیدیوں سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکیں۔“

”فکر نہ کریں ابا جان۔“ فرزانہ جذبات سے لبریز آواز میں بولی۔

”لیکن اس کی کیا ضرورت ہے جمشید، ہم لوگ یہیں سے سرنگ کا رخ کر سکتے ہیں۔“ پروفیسر داؤد پریشان ہو کر بولے۔
 ”نہیں پروفیسر صاحب، یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں کیا کام کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“
 ”لیکن یہ بات ڈی سائٹ کو نہیں، اس ملک کے صدر کو معلوم ہے۔“ خان رحمان نے اعتراض کیا۔

”بس دیکھتے جاؤ، اس وقت تک ڈی سائٹ کی مرضی کے مطابق ہر کام ہوتا رہا ہے، اب ہماری باری ہے۔“ وہ بولے۔
 ”لیکن آپ ڈی سائٹ کے گھر تک کس طرح جائیں گے۔ بندوین میں کیا آپ راستوں کا اندازہ لگا سکے تھے؟“

”یہ کوئی مشکل نہیں۔ ڈی سائٹ بہت مشہور آدمی ہے۔ اس کے گھر کا پتا معلوم ہو جائے گا۔“ انہوں نے جواب دیا۔ اور پھر ایک چوراہے پر دین روک کر انہوں نے چوراہے پر کھڑے ایک کانشیل کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑ کر آیا اور تھر تھر کانپتی آواز میں بولا:

”لیس سر۔“

”مجھے مسٹر ڈی سائٹ کے گھر جانا ہے، لیکن میری طبیعت بہت خراب ہے۔ کیا تم گاڑی چلا سکتے ہو۔“

”کیوں نہیں سر۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”کیا تم جانتے ہو، میں کون ہوں؟“

”یہ بات کون نہیں جانتا، آپ مسٹر ڈی سائٹ کے ذاتی عملے سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا نام مسٹر غوربان ہے۔“

”خوب، تم بہت عقل مند ہو، چلو بیٹھ جاؤ اور گاڑی چلاؤ اور ہاں مجھے بہت جلدی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر، میں ڈرائیونگ میں بہت ماہر ہوں اور پچھلے سال میں نے انعام بھی جیتا تھا۔“

”یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اب ذرا عملی طور پر ثبوت دو۔“ وہ بولے۔
 ”اوکے سر، لیکن میری ڈیوٹی کا کیا ہوگا سر، میری تو رپورٹ ہو جائے گی۔“
 ”فکر نہ کرو، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اس وقت میرا سر بہت چکرا رہا ہے، کہیں گاڑی ادھر ادھر نہ لکرا دوں اور ادھر مسٹر ڈی سائٹ کا حکم ہے کہ جلدی پہنچوں۔“
 ”بہت بہتر، یہ لیجیے، میں چل پڑا۔“ باتونی کانشیل نے کہا۔

گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی اور روانہ ہو گئی۔ اندر بیٹھے ان کے ساتھی حیران رہ گئے کہ انہوں نے یہ مسئلہ کتنی آسانی سے حل کر لیا تھا، لیکن چونکہ گاڑی میں کانشیل موجود تھا، اس لیے بات چیت نہیں کر سکتے تھے، لہذا دم سادھے بیٹھے رہے، آخر خدا خدا کر کے دین رکی اور کانشیل کی آواز ابھری:

”لیجیے، ہم پہنچ گئے۔“

”شکریہ، اب تم کسی فیکسی سے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاؤ اور اگر کوئی بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔“

”اوکے سر۔“ اس نے کہا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا چلا گیا۔

”تم لوگ اندر ہی بیٹھے رہو، پہلے میں دستک دوں گا، پھر صورت حال کے مطابق تمہیں ہدایات دوں گا۔“

”جی بہتر۔“ محمود نے کہا۔

انسپکٹر جمشید دین سے اترے اور گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک منٹ بعد

”غوربان، تم۔ تم ان لوگوں کو واپس کیوں لے آئے؟“

”ہاتھ اوپر اٹھا کر بات کرو ڈی سائٹ۔ غوربان اس وقت قید خانے میں آرام کر رہا ہے۔“ انسپکٹر جمشید کی آواز کمرے میں ابھری۔ ڈی سائٹ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ ان میں خوف سمٹ آیا۔ مشینی انداز میں اس کے ہاتھ اوپر اٹھتے چلے گئے۔

”یہ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس کے منہ سے نکلا۔

”جو لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ چالاک خیال کرتے ہیں، وہ اسی طرح مارکھا جایا کرتے ہیں۔ تمہیں اپنی ذہانت پر بہت ناز تھا اور تم نے ہمیں بالکل چوہوں کی طرح پکڑ لیا تھا، لیکن دیکھ لو، ہم بھی تمہاری قید سے اس طرح نکل آئے ہیں، جس طرح مکھن سے بال۔ بلکہ ہم نے تو اس کو ٹھڑی میں قدم تک نہیں رکھا۔ ہاں غوربان اور اس کے ساتھی ضرور اس میں بند ہیں اور مزے کی بات یہ کہ قید خانے کے محافظوں کو اس تبدیلی کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکی۔ میں تم سے شاہانہ سلوک کر سکتا ہوں۔ اگر تم میرے چند سوالات کے جواب دے دو۔ بصورت دیگر تمہیں موت کو گلے لگانا ہی ہوگا۔“

”تم۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے بوکھلا کر کہا۔

”تم نے بتایا تھا، تمہارے ملک کے صدر ہمارے ملک میں کچھ کارروائیاں شروع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن ہماری موجودگی میں ان کارروائیوں کی دال گلنے کا امکان نہیں تھا، لہذا تمہیں حکم دیا گیا کہ ہمیں پکڑ کر یہاں لے آیا جائے، چنانچہ ہم یہاں آ گئے۔ تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کارروائیوں کے بارے میں تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں، لیکن مجھے تمہاری اس بات پر یقین نہیں۔ میں جانتا ہوں، تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔“

دروازہ کھلا اور سام لٹ کی صورت دکھائی دی۔ دروازے پر غوربان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”خیر تو ہے غوربان؟ تم پھر آ گئے۔“

جواب میں اس کی ٹھوڑی پر ایک بھرپور مٹکا لگا۔ وہ تیور کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ مٹکا کچھ اسی انداز کا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے تیزی سے جھکتے ہوئے اسے کندھے پر ڈالا اور وین کے پچھلے حصے کی طرف لے آئے، سوراخ میں سے ان کے ساتھی یہ منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

”اسے بھی باندھ دو، مٹائی سے کام چلاؤ اور منہ میں رومال بھی۔“

انہوں نے کہا۔

محمود اور فاروق نے آن کی آن میں اسے باندھ کر رکھ دیا۔

”نیچے اتر آؤ اور وین کا دروازہ بند کر دو۔“

وہ آگے بڑھے اور دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ راستہ کم از کم ان کا جانا

پہچانا تھا۔

ڈی سائٹ کے کمرے میں موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا، لیکن کھڑکیاں کھلی تھیں۔ انہوں نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ محمود نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ چٹخنی لگنے کی آواز بھی موسیقی کی آواز تلے دب گئی۔ ڈی سائٹ کمرے میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، تاہم غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ نہار ہاتھا۔ وہ نہایت اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رائفلوں کا رخ غسل خانے کی طرف ہو گیا۔ آخر دروازہ کھلا اور ڈی سائٹ تو لیے میں لپٹا باہر نکلا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ حیرت کی زیادتی سے وہ چلا اٹھا۔

”تم یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو۔“ اس نے حیران ہو کر

کہا۔

”تم اس ملک کے معمولی آدمی نہیں ہو، لہذا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ صدر نے تم سے کوئی بات چھپائی ہو۔ دوسرے یہ کہ تم یہ کہہ رہے تھے کہ میں اپنے کام سے کام رکھا کرتا ہوں۔ اس وقت تمہارے چہرے کے تاثرات پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ تم سفید جھوٹ بول رہے ہو اور یہ کہ ان کارروائیوں کے بارے میں تمہیں سب کچھ معلوم ہے، لہذا میں جاننا چاہتا ہوں، ان کارروائیوں کی تفصیل کیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”تب پھر ہمیں بھی تمہاری ضرورت نہیں۔ خان رحمان اس کی پیشانی میں

گولی اتار دو۔“

خان رحمان نے ایک لفظ کہے بغیر رائفل سیدھی کی اور انگلی سے ٹریگر پر دباؤ ڈالنے لگے۔ اچانک فرزانہ چلا اٹھی:

”ایک منٹ انکل، گولی چلنے کی آواز ہمیں مشکل میں مبتلا کر دے گی۔ میں

ذرا موسیقی کی آواز اور اونچی کر دوں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

”غلط ترکیب تو یہ بتائی نہیں سکتی۔“ فاروق نے منہ بتایا۔

فرزانہ نے آگے بڑھ کر آواز پوری کھول دی، پھر مڑتے ہوئے بولی:

”اب آپ اپنا کام نہایت اطمینان سے کر سکتے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں

گزرے گا کہ اس ملک کی ایک اہم شخصیت کو موسیقی کے شور میں گولی مار دی گئی اور گولی

مارنے والے وہ لوگ تھے جنہیں اہم شخصیت چوہوں کے برابر خیال کر بیٹھی تھی۔“

خان رحمان نے ڈی سائٹ کی پیشانی کا نشانہ لے لیا، لیکن وہ شدید

الجھن میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے صاف حکم دیا تھا کہ گولی مار دی جائے، لیکن دوسری طرف ان کا بیان یہ تھا کہ دی سائٹ کو حکومت کے منصوبوں کا علم ہے۔ اس صورت میں تو اسے ختم کر دینا عقل مندی نہیں تھی، تاہم وہ یہ بات بھی جانتے تھے، انسپکٹر جمشید نے یہ حکم بلا وجہ نہیں دے دیا۔ آخر انہوں نے ٹریگر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک ڈی سائٹ کے چہرے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ اچانک اس نے کہا:

”ٹھہرو، میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔“

خان رحمان کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ہاں جمشید، اب کیا کہتے ہو؟“

”ٹھہر جاؤ خان رحمان، لیکن نشانہ پیشانی کا ہی لیے رہنا۔ ڈی سائٹ اس جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہ کرے۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”جلدی بتاؤ ڈی سائٹ، وہ کیا منصوبے ہیں، جن پر تمہارا صدر ہمارے

ملک میں کام شروع کرانا چاہتا ہے؟“

”ہم نے تمہاری فوج کو بزدل بنانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ سوچا ہے۔

اس طریقے پر عمل شروع ہونے ہی والا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور وہ طریقہ کیا ہے؟“ انسپکٹر جمشید حیران ہو گئے۔

”اس کے علاوہ تمہارے ملک کے عوام کی اکثریت کونشہ آور دواؤں کا

عادی بنادینے کا ایک جدید طریقہ سوچا گیا ہے۔“ اس نے ان کی بات کا جواب دیے

بغیر کہا۔ لہجہ میں نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

”اوہ۔“ ان کے منہ سے نکلا۔

”تیسرے پیمانے پر انتظامی ڈھانچے کی باری آتی ہے۔ ملک کی انتظامیہ کے اعلیٰ ارکان ایک ایک کر کے خرید لیے جائیں گے۔ انہیں خریدنے کے لیے بھی جدید ترین حربوں سے کام لیا جائے گا۔ پھر اکبر بھورانی وغیرہ کو اشارہ دے دیا جائے گا کہ ہر شہر میں ایک اکبر بھورانی حکمران بن جائے۔ پچاس سال بعد نتیجہ یہ نکلے گا کہ پوری قوم تباہی کے گڑھے تک پہنچ جائے گی اور حکومت عملی طور پر ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔

”تم نے یہ نہیں بتایا کہ فوج کو بزدل کس طرح بنا دیا جائے گا۔“

”قلموں کے ذریعے، جنگ کے موضوع پر ہم نے ہزاروں قلمیں تیار کرائی ہیں۔ یہ قلمیں ہمارے ملک کا کوئی شہری نہیں دیکھ سکا۔ صرف ان ماہرین نے دیکھی ہیں، جو اس منصوبے کے لیے عملی کام کر رہے ہیں۔ اب یہ قلمیں چوری چھپے فوجیوں تک پہنچائی جائیں گی۔ ان میں عربیائی اور فحاشی کے ساتھ ساتھ جنگ سے نفرت پیدا کرنے والے واقعات ہیں۔ جنگ کی ہولناکیوں کی ایسی کہانیاں قلمیائی گئی ہیں کہ آہستہ آہستہ فوج جنگ سے نفرت کرنے لگے گی اور بزدل ہوتی چلی جائے گی۔ دوسری طرف ہم نے اپنی فوج کے لیے جرأت مندانہ کارناموں سے لبریز قلمیں تیار کرائی ہیں۔ ان میں سے ایک قلم بھی تمہارے ملک میں نہیں جاسکے گی۔ یہ صرف ہمارے فوجی اور شہری دیکھیں گے۔“ وہ کہتا چلا گیا۔ اس کے الفاظ ان کے جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑاتے چلے گئے۔

”اور نشہ آور ادویات اب ہم اپنے ملک میں تیار نہیں کریں گے۔ اکبر بھورانی جیسے لوگوں کو اشارہ دے دیا گیا ہے۔ وہ ہیروئن چرس، کوکین وغیرہ قسم کی ادویات اب تمہارے ملک میں ہی خفیہ طور پر تیار کریں گے اور اتنے بڑے پیمانے پر تیار کریں گے کہ پورے ملک میں گویا ان کا سیلاب آ جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر

دوسرا آدمی ان کا عادی نظر آنے لگے گا۔ اس قسم کے پلانٹ لگانے کے لیے دوہرا کام کیا جائے گا۔ بڑے بڑے شہروں میں کارخانے خرید لیے جائیں گے، بھاری منافع دے کر۔ پھر ان کارخانوں میں دکھاوے کے طور پر تو عام مصنوعات تیار ہوں گی، وہ بھی ناقص قسم کی، لیکن درحقیقت ان میں نشہ آور ادویات تیار ہوا کریں گی اور پورے ملک میں پھیلائی جائیں گی۔“

”اور انتظامی ڈھانچہ کس طرح تباہ کیا جائے گا۔“ انسپکٹر جمشید نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”ان لوگوں کو انتہائی قیمتی چیزوں کے ذریعے خرید ا جائے گا۔ ایسی چیزیں جو انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔“

”ہوں، تو یہ ارادے ہیں، لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے منصوبے شروع کرنے سے پہلے ہمیں قیدی بنانے کی کیوں سوچی گئی۔ بھلا ان معاملات میں ہم کس طرح رکاوٹ بن سکتے تھے؟“

”تمہارے ملک میں سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ اگر ایک بھی سمجھ دار فوجی ان قلموں کے اصل مقصد کو محسوس کر کے تمہیں یا کسی اور آفیسر کو اطلاع کر دیتا اور اس کے ذریعے تمہیں اطلاع ملتی تو تم متوجہ ہو سکتے تھے اور اصل منصوبے کی تہ تک پہنچ جاتے اسی طرح دوسرے دو منصوبے بھی تمہارے علم میں آ سکتے تھے اور پھر تم معاملے کی تہ تک پہنچ جاتے۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر ہمارے قید میں آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابھی ملک میں انسپکٹر کامران مرزا بھی موجود ہیں۔“

”ان لوگوں کو پکڑ کر لانے کا منصوبہ ترتیب دیا جا چکا ہے۔ آج کل میں وہ

بھی آجائیں گے۔“

”اوہ، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، ہم واپس جا کر انہیں خبردار کر دیں گے۔“

”لیکن مشکل یہ ہے کہ تم یہاں سے جا نہیں سکو گے۔ اس وقت تک اس

مکان کو ملٹری والے پوری طرح گھیر چکے ہیں۔ میں غسل خانے کے دروازے میں

لگے ایک خفیہ بٹن کے ذریعے انہیں خبردار کر چکا ہوں۔ اب تم بے شک مجھے گولی مار

دو۔ میں نے تمہارے فرار کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔“ اس نے پرسکون لہجے

میں کہا۔

”نہیں، تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔“ خان رحمان نے بھنا کر کہا۔

”یقین نہیں تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لو، ملٹری ہی ملٹری نظر آئے گی۔ تم

ایک بار پھر میرے جال میں پھنس چکے ہو اور بے فکر رہو، اس مرتبہ میں تم لوگوں کو فرار

نہیں ہونے دوں گا۔“

”ہمیں اگر گھیر لیا گیا تو کیا ہوا، تم بھی ہمارے نشانے کی زد میں ہو۔“ محمود

نے منہ بٹا کر کہا۔

”مجھے اپنی پروا نہیں، میں مر بھی گیا تو کیا، تم لوگوں کو تو مرتے مرتے بھی

پھنسا گیا نا۔“

”محمود، کھڑکی سے جھانک کر دیکھو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود نے فوراً کھڑکی کی طرف قدم اٹھا دیے اور پھر اس کا رنگ سفید

پڑ گیا۔

”اف خدا، باہر تو پوری فوج موجود ہے۔“

”اچھا ٹھہرو، میں ان کا انتظام کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ اپنی جگہ سے

حرکت کی اور ڈی سائٹ کی کمر پر پینچے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے دائیں ہاتھ کی ہڈی

اس کی گدی پر لگی۔ وہ چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی اس کا

کوٹ پہنا اور ہیٹ سر پر رکھ لیا، چشمہ آنکھوں پر لگا لیا اور کھڑکی کی طرف بڑھے۔

انہوں نے چہرے کو تر چھار کھتے ہوئے حلق سے ڈی سائٹ کی آواز نکالی:

”مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ صدر صاحب کے محل پر حملہ ہونے والا

ہے۔ یہ حملہ دشمن ملک کے ایجنٹوں کی طرف سے کیا جائے گا، لہذا تم فوراً صدر صاحب

کے محل کو گھیر لو۔ میری اجازت کے بغیر پرندہ بھی اندر پرندہ مار سکے۔ جب تک میں نہ

پہنچوں، محل گھیرے میں رہے۔ بس روانہ ہو جاؤ۔“

ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی فوجی منتشر ہونے لگے اور انہوں نے کھڑکی

بند کر دی۔

”اف اللہ، کتنی سادہ ترکیب سے کام چلا لیا آپ نے۔“ فرزانہ نے خوش

ہو کر کہا۔

”عقل سے بڑھ کر کوئی ہتھیار ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ مسکرائے۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”ڈی سائٹ کو بھی بانڈھ دو۔ ہم اسے ساتھ لے کر چلیں گے۔ اور اپنے

ملک میں قیدی رکھیں گے۔“

”ویری گڈ، یہ ہوئی نابات۔“ خان رحمان خوش ہو گئے۔

انہوں نے جلدی جلدی ڈی سائٹ کو بانڈھ دیا، پھر کھڑکی کھول کر دیکھا تو

میدان صاف تھا۔

”خان رحمان تم جا کر دین کو دروازے کے قریب لے آؤ۔ اس کا پچھلا

حصہ دروازے سے لگا دینا، تاکہ ہم نہایت خاموشی سے ڈی سائٹ کو دین میں ڈال

دیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ تم اس پورے مکان کی جلدی جلدی تلاشی لے ڈالو۔
فائلیں، کاغذات اور اس قسم کی جتنی بھی اہم چیزیں مل سکیں، نکال لاؤ، شاید یہاں سام
لٹ اور ڈی سائٹ کے سوا کوئی نہیں۔ یہ مکان دراصل ڈی سائٹ کا دفتر ہے، اس کا
اپنا گھر نہیں، ورنہ یہاں دوسرے لوگ بھی ہوتے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ بھی حرکت میں آ گئے۔ آدھ گھنٹے بعد ان کی دین
اڑی جا رہی تھی۔

”کیا اب ہم سرنگ کی طرف جا رہے ہیں ابا جان؟“ فاروق نے پوچھا۔
”بھلا ہم سرنگ کی طرف کس طرح جا سکتے ہیں، جب کہ اس قید خانے
کے قیدیوں سے وعدہ کر چکے ہیں کہ انہیں رہائی دلائیں گے۔ ہماری اس کامیابی میں
دراصل ان قیدیوں کا بھی ہاتھ ہے۔“
”قیدیوں کا ہاتھ؟“ فاروق بڑبڑایا۔

”ہاں، اگر وہ کھانے کے لیے شور مچادیں تو نگران اندر داخل ہو کر ڈانٹ
ڈپٹ شروع کر دیں اور اس طرح انہیں ایک کوٹھڑی میں غور بان اور اس کے ساتھی
بندھے ہوئے مل جائیں گے، لہذا ہم مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔ قیدی صرف ہماری
وجہ سے خاموش ہیں اور ان کی اس خاموشی، یعنی مدد کا صلہ انہیں ضرور ملنا چاہیے۔ یوں
بھی میں نے ان سے وعدہ کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر چلیے۔ پہلے قید خانے کی طرف ہی چلتے ہیں، لیکن
ابا جان، میں اس موقع پر ایک بات کہے بنا نہیں رہ سکتی۔“ فرزانہ بولی۔
”ایک کیا، ایسے موقعوں پر تو تم کئی باتیں کہے بنا نہیں رہتیں۔“ فاروق نے

منہ بتایا۔

”اور وہ یہ کہ اس وقت سرنگ کے دہانے پر کوئی نہیں ہوگا، کیونکہ فوجی جب

بھی صدر کے محل تک نہیں پہنچ جاتے، اس وقت تک کسی کو گڑبڑ کا احساس نہیں ہوگا،
لیکن وہاں پہنچنے کے بعد شاید جلد ہی گڑبڑ کا پتا چل جائے گا اور اس صورت میں ہوگا یہ
کہ فوجی سب سے پہلے سرنگ کے دہانے کا رخ کریں گے، کیونکہ وہ جانتے ہیں، ہم
صرف اسی راستے سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”زیادہ عقل مند بننے کو کوشش نہ کرو۔ بھلا فوجیوں کو محل تک پہنچنے ہی کس
طرح گڑبڑ کا پتا چل جائے گا۔“ محمود نے بھنا کر کہا۔

”صدر کو جب یہ اطلاع ملے گی کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے اور یہ کہ
فوجیوں کو ان کی حفاظت کے لیے ڈی سائٹ نے بھیجا ہے تو پہلا کام وہ یہ کرے گا کہ
فورا ڈی سائٹ کو فون کرے گا، لیکن ڈی سائٹ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا،
نہ سام لٹ فون کا ریسپورسٹ آئے گا۔ فوری طور پر معلوم کرایا جائے گا کہ ڈی سائٹ اور
سام لٹ کہاں ہیں یا انہیں کیا ہوا اور اس طرح گڑبڑ کا احساس ہو جائے گا۔ بس فوری
طور پر سرنگ کی طرف فوجی روانہ کر دیے جائیں گے اور قید خانے کی طرف بھی۔ اس
طرح ہم ایک بار پھر مشکل میں پھنس جائیں گے اور یہ صرف ان قیدیوں کی وجہ سے
ہوگا۔ وہ قیدی اگر ہمارے ملک کے ہوتے تو اور بات تھی، لیکن وہ ادھر ادھر کے ملکوں
کے ہیں، لہذا کیوں نہ ہم سیدھے سرنگ کی طرف چلیں۔“

”کیا تم ابا جان کو وعدہ خلاف بنانا چاہتی ہو؟“ فاروق نے جھنجھلا کر کہا۔

”ابا جان، آپ کیا کہتے ہیں؟“ محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

”فرزانہ کے اندازے غلط نہیں۔ ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح ہو، لیکن اس
کے باوجود میں ان قیدیوں کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ ہمیں ان سے بھی کام لینا پڑے
گا۔“

”جی وہ کیسے؟ بھلا ہم ان قیدیوں سے کیا کام لیں گے؟“ محمود بولا۔

”بس دیکھتے جاؤ۔ فی الحال توقید یوں کورہا کرانے کا مسئلہ ہے۔“

آخر دین قید خانے کے سامنے رک گئی۔ اب انسپکٹر جمشید ڈی سائٹ کے لباس میں تھے اور ہیٹ چونکہ پیشانی پر بہت زیادہ جھکا ہوا تھا۔ اس لیے دور سے پہچانے نہیں جاسکتے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے لوہے کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

”چابیاں۔“ وہ بولے۔

فوراً ہی چابیاں پیش کر دی گئیں۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے جلدی جلدی کوٹھڑی کھولنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر قیدیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگے۔ ایک ایک کر کے تمام کوٹھڑیاں کھل گئیں، بس غور بان والی بند رہنے دی گئی۔ وہ لوگ کوٹھڑی میں بُری طرح لڑھکتے پھر رہے تھے۔

”باہر نکل کر اچانک محافظوں پر حملہ کرنا ہوگا۔ وہ بے خبری میں جلدی مارے جائیں گے۔ اس کے بعد قید خانے کے باہر کھڑی گاڑیوں پر قبضہ کر لینا اور ہماری دین کے تعاقب میں چلے آنا۔“ انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں قیدیوں کو ہدایات دیں۔

”آپ فکر نہ کریں جناب، ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ ہم میں سے اکثر نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ انسپکٹر جمشید ہیں نا، مشہور و معروف سراغ رساں۔“

”ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایک سینڈ تپتی ہے۔“ انہوں نے کہا اور لوہے کے دروازے پر تین بار انگلی سے ٹھک ٹھک کی اور پھر دھپ رسید کی۔ رائفلیں اب ان کے ہاتھوں میں تیار تھیں۔ جوں ہی دروازہ کھلا، انہوں نے فائر کھول دیا۔ قیدی بھڑ مار کر باہر نکلے اور بچے کھچے محافظوں پر ٹوٹ

پڑے۔ چند منٹ میں میدان صاف تھا۔ محافظوں کو کوٹھڑیوں میں بند کر کے تالے لگا دیے گئے اور گاڑیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہ قید خانہ شہر سے باہر تھا۔ شہری آبادی کا یہاں دور دور تک پتا نہیں تھا۔

اب ان کا قافلہ سرنگ کی طرف روانہ ہوا۔

”یہاں تک تو ٹھیک رہا۔ اب آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“

”کاش، ابھی تک کسی کو گڑبڑ کا احساس نہ ہوا ہو اور ہم سرنگ تک پہنچ جائیں۔“ فرزانہ بولی۔

”سرنگ کے پاس پہنچنے کے بعد بھی مسئلہ تو حل نہیں ہو جائے گا۔ پہلا کام تو سرنگ کا دہانہ تلاش کرنا ہوگا اور اس کے بعد کھولنے کی ترکیب۔“ فاروق نے کہا۔

”سرنگ کا دہانہ میں تلاش کر دوں گا کھولنے کی ترکیب فرزانہ بتائے گی، کیونکہ ترکیبیں بتانا صرف اور صرف اس کا کام ہے۔“ محمود نے کہا۔

”تم سرنگ کا دہانہ کس طرح تلاش کر دو گے؟“ فاروق نے اسے گھورا۔

”جادو کے ذریعے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”تو کیا تم ترکیبیں جادو کے ذریعے بتاتی ہو؟“ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

ان کا سفر آدھ گھنٹے تک جاری رہا، پھر ان کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن میں انہوں نے پناہ لی تھی اور ہیلی کاپٹروں نے ان پر فائرنگ کی تھی اور ابھی وہ سرنگ کے دہانے سے کافی دور تھے کہ انسپکٹر جمشید نے دین روک دی۔ ان کے پیچھے دوسری گاڑیاں بھی رک گئیں۔

”کیا بات ہے ابا جان؟“

”مم، میں۔ میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ بولے۔

”خطرہ، لیکن یہاں تو دُور دُور تک خطرہ نظر نہیں آ رہا۔ یہاں تک کہ سرنگ کے نزدیک ایک فوجی بھی دکھائی نہیں دے رہا۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”اسی لیے تو میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ فرزانہ نے الجھن کے عالم میں کہا۔

”فرزانہ، تم نے ہی تو کہا تھا کہ قیدیوں کو چھڑانے کی صورت میں ہمیں خطرات کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں دُور دُور تک کوئی فوجی نہیں ہے، آخر کیوں؟ فوجی محل تک پہنچ چکے ہوں گے تو کیا صدر صاحب نے ڈی سائٹ کو فون کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔“

انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کے خیال میں تو یہ وقت آگے بڑھ جانے کا تھا۔ لیکن ان کے والد کہہ رہے تھے، پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔

”لیکن کیوں ابا جان، ہم کیوں پیچھے ہٹ جائیں۔ وقت تو آگے بڑھ کر سرنگ کا دہانہ تلاش کرنے اور اسے کھولنے کا طریقہ معلوم کرنے کا ہے، نہ کہ پیچھے ہٹنے کا۔“ فرزانہ بے چینی ہو گئی۔

”کیا تم یہ چاہتی ہو، ہم سب کے سب بھون ڈالے جائیں؟“ انسپکٹر جمشید بھناٹھے۔

”نہیں تو، بھلا میں یہ کیوں چاہوں گی۔“ وہ بوکھلا کر بولی۔

”تب پھر جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔“

اور وہ گاڑیوں کو وہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ مڑ مڑ کر سرنگ کے دہانے کی سمت میں بھی دیکھ رہے تھے۔

”اگر سرنگ کا دہانہ ان پہاڑیوں میں کہیں ہے تو پیچھے ہٹنے کی کیا تنگ

ہے۔“ ایک قیدی نے تلملا کر کہا۔

”اس وقت تم سب لوگوں کی کمان میرے ہاتھ میں ہے، لہذا جو میں کہوں، صرف وہ کرو۔“

”لیکن ہم دوبارہ اس ملک کے قیدی نہیں بننا چاہتے۔“ وہی قیدی بولا۔

”پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ وہ بولے۔

”ہم ان پہاڑوں تک پہنچ کر سرنگ کا دہانہ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ دشمن کے فوجی کی وقت بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اس صورت میں بھی یہ پہاڑ ہمارے مددگار ثابت ہوں گے، کیونکہ کمر کی طرف سے ہم پر حملہ نہیں کیا جاسکے گا۔“ قیدی نے کہا۔

”میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”جمشید، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ خان رحمان بولے۔

”چپ رہو خان رحمان۔“ انسپکٹر جمشید بھٹا کر بولے اور خان رحمان سہم سے گئے۔ انسپکٹر جمشید نے آج تک ان سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد بھی بوکھلا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی وقت اس قیدی نے باقی قیدیوں کی طرف دیکھ کر کہا:

”یہ صاحب وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں سرنگ کے دہانے کی تلاش میں جا رہا ہوں، تم میں سے کون کون میرا ساتھ دے گا۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ ایک دوسرا قیدی بولا۔

”اور میں بھی۔“

تقریباً دس قیدی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ باقی شش و پنج کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔

”اب بھی وقت ہے، میری بات مان لو، آگے نہ بڑھو۔“
 ”تم نے ہمیں قید سے نجات دلائی ہے، تمہارا شکریہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب
 نہیں کہ ہم تمہارے غلام بن کر رہ جائیں۔“ قیدی نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر
 آگے بڑھ گیا۔ ان کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کھیتوں سے آگے
 نکل گئے، پھر اچانک فائرنگ کی ہولناک آواز گونجی اور وہ زمین پر گر کر رڑ پنے لگے۔

☆☆☆

غلط سُرنگ

ان پر سکتے کی حالت طاری ہو گئی۔ ان کے ساتھ ٹھہر جانے والے قیدی تو
 کانپ اٹھے۔

”اُف خدا، یہ کیا ہوا؟“

”یہی میرا خیال تھا کہ دشمن فوجی کھیتوں میں چپے ہمارا انتظار کر رہے ہیں،
 تاکہ ہم سب اندھا دھند موت کے منہ میں جا گریں۔“ انسپکٹر جمشید افسوس زدہ لہجے
 میں بولے۔

”اب کیا ہوگا جمشید؟“ خان رحمان نے کپکپاتی آواز میں کہا۔
 ”ہوگا یہ کہ ہم اس طرف سے نہیں جا سکیں گے۔ اب یہ لوگ یہاں سے
 نہیں اٹھیں گے، بلکہ ہمیں ہوشیار پا کر سرنگ کے دہانے کی طرف چلے جائیں گے۔“
 انہوں نے جواب دیا۔

”تب پھر ہم کس طرف سے جائیں گے۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا، قیدیوں کو چھڑانے کے چکر میں ہمیں دیر
 ہو جائے گی۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔

”لیکن میں ان لوگوں سے وعدہ کر چکا تھا۔ انہوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا
 تھا، پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہم ان کا خیال نہ کرتے۔“

”حیرت تو یہ ہے کہ یہ فوجی صرف سرنگ کی طرف جانے والوں کو کیوں نشانہ بنارہے ہیں، وہ تو اس طرف رخ کر کے بھی فائرنگ کر سکتے ہیں، جہاں ہم کھڑے ہیں۔“ خان رحمان بڑبڑائے۔

”ہماری بے بسی سے لطف اندوز ہو..... اہو، ہم تو ان لوگوں کا ناطقہ بند کر سکتے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید چونک پڑے۔

”وہ وہ کیسے؟“ محمود جلدی سے بولا۔

”ہمارے پاس دو قیدی ہیں۔ ڈی سائٹ اور سام لٹ۔ ہم ان کو آڑہ بنا کر سرنگ کی طرف جا سکتے ہیں۔ دشمن فوجیوں کو شاید اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ خان رحمان تین قیدیوں کو ساتھ لے کر وین تک جاؤ اور اس میں سے دونوں کا نکال لاؤ۔“ جلدی کرو۔ ابھی ہم کچھ بھی نہیں ہارے۔“

”دیر ی گڈ، یہ ہوئی نابات۔“ خان رحمان خوش ہو گئے۔

دومنٹ بعد ہی وہ ڈی سائٹ اور سام لٹ کو لے آئے۔

”مسٹر ڈی سائٹ، ان کھیتوں میں تمہارے فوجی موجود ہیں۔ انہیں حکم دو کہ اسلحہ پھینک دیں اور فائر ہرگز نہ کریں، ورنہ ہم تمہیں بھون ڈالیں گے۔ ان سے کہو، ہمیں سرنگ کے دہانے تک جانے دیں، کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔“

ڈی سائٹ سوچ میں ڈوب گیا، پھر زور سے چونکا اور خوش ہو کر بولا:

”ضرور ضرور، کیوں نہیں۔ میں ابھی انہیں ہدایات دیتا ہوں۔“

وہ الجھن میں مبتلا ہو گئے۔ نہ جانے ڈی سائٹ کس خیال پر چونکا تھا اور

ایک ایک خوش کیوں ہو گیا تھا۔ انہوں نے سنا، وہ کہہ رہا تھا:

”لیکن تم لوگوں کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا؟“ انہوں نے جلدی سے کہا۔

”تم لوگ مجھے اور سام لٹ کو ہلاک نہیں کرو گے۔“

”اگر تم نے کوئی چال نہ چلی، تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ وہ بولے۔

”تو ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں، کوئی چال نہیں چلوں گا اور تم لوگوں کو بخیریت جانے دیا جائے گا۔“

”تب پھر فوجیوں کو ہدایات دو، وقت بہت کم ہے۔“

”خبردار، میں ڈی سائٹ ان لوگوں کے ساتھ ہوں۔ تم میں سے کوئی فائر نہ کرے، بلکہ تم اپنا اسلحہ پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کر کھیتوں سے باہر نکل آؤ۔“ یہ الفاظ اس نے بلند آواز میں کہے۔

لیکن اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی گئی۔

”یہ کیا، تم لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رہیں گی۔ میں کہتا ہوں اسلحہ پھینک دو۔“

”ہم تمہاری چال میں آنے والے نہیں۔ ہم جانتے ہیں، تم انسپکٹر جمشید ہو

اور مسٹر ڈی سائٹ کے میک اپ میں ہو۔ ان کی آواز کی کامیاب نقل اتار رہے ہو۔“

”تم لوگ عقل کے اندھے ہو، تمہارا لیڈر جو کوئی بھی ہے، نزدیک آ کر

دیکھ لے۔ ان لوگوں کے ساتھ واقعی میں کھڑا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں، لیکن اگر مجھ پر فائرنگ کی گئی تو ہم بھی اندھا

دھند فائر کھول دیں گے۔“ ایک آواز سنائی دی۔

اور پھر ایک لمبے قد کا آدمی کھیتوں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے ڈی

سائٹ کی شکل سے ملتے جلتے دو آدمی دیکھے تو چکر اگیا۔

”آپ میں مسٹر ڈی سائٹ کون ہیں؟“

”یہ میں ہوں احق۔ یہ شخص انسپکٹر جمشید ہے۔ انہوں نے رافٹیں مجھ پر

تان رکھی ہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں، کرو، ورنہ تم لوگوں کا حشر بہت بُرا ہوگا۔“
 ”ابھی لیجیے جناب۔“ اس نے کانپ کر کہا، پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا:
 ”سب لوگ ہتھیار ڈال دیں اور ہاتھ اوپر اٹھائے باہر آ جائیں۔“ فوراً
 تعمیل کی گئی۔

”ہم لوگ مسٹر ڈی سائٹ اور سام لٹ کو لیے سرنگ کے دہانے کی طرف
 جا رہے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے کوئی شرارت نہ کی تو یہ دونوں زندہ سلامت تمہارے
 پاس آ جائیں گے، ورنہ ہم ان کی زندگیوں کی ضمانت نہیں دے سکتے۔“
 ”خبردار، تم میں سے کوئی غلط حرکت نہ کرے۔“
 ”اوکے سر، آپ فکر نہ کریں۔“ کیپٹن نے کہا۔

اور وہ ایک ایک قدم اٹھاتے آگے بڑھے۔ سام لٹ اور ڈی سائٹ کو
 انہوں نے اپنے آگے رکھا ہوا تھا اور رائفلوں کی سنگینیں ان کی کمریوں کو چھو رہی تھیں۔
 کچھ اور آگے بڑھنے پر انہیں ان دونوں کو بائیں ہاتھ لے لیتا پڑا۔ وہ ان دونوں کو
 اپنے اور دشمن فوجیوں کے درمیان میں رکھنا چاہتے تھے۔

آخر وہ اس جگہ پہنچ گئے، جہاں ان کے خیال میں سرنگ کا دہانہ تھا۔
 ”شکریہ مسٹر ڈی سائٹ، اب مہربانی فرما کر سرنگ کا دہانہ بھی کھول
 دیں۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور نہ جانے کیا کیا کہ
 گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ پتھر سرک گیا اور سرنگ نظر آنے لگی۔

”اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔
 ”پہلے تم۔ اپنے آدمیوں کو حکم دو، وہ گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ
 ہو جائیں اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھیں، جب انہیں روانہ ہوئے پندرہ منٹ گزر جائیں

گے۔ اس وقت ہم تم دونوں کو جانے کی اجازت دے دیں گے۔“ انسپکٹر جشید
 مسکرائے۔

”لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم لوگ سرنگ کے دہانے پر کھڑے
 ہو، اندر داخل ہو جاؤ اور سرنگ بند کر لو۔“ ڈی سائٹ نے کہا۔

”لیکن اس طرح تم ہماری گرفت سے آزاد ہو جاؤ گے اور فوراً اپنے
 آدمیوں کو حکم دو گے کہ سرنگ کا دہانہ کھول کر ہم پر حملہ کر دیں۔“

”ہوں، ٹھیک ہے، تم واقعی بہت چالاک ہو۔ اچھا ٹھہرو، میں انہیں حکم دیتا
 ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ منہ کے گرد رکھے اور بلند آواز میں بولا:

”تم لوگ اپنا اسلحہ اسی حالت میں چھوڑ کر گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر کی طرف
 روانہ ہو جاؤ۔ خبردار پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔“

اس حکم کے فوراً بعد فوجیوں نے گاڑیوں کا رخ کیا اور ان کے دیکھتے ہی
 دیکھتے گاڑیاں روانہ ہو گئیں، پھر تقریباً دس منٹ گزر گئے تو ڈی سائٹ نے کہا:

”میرا خیال ہے، اب تو تمہارا اطمینان ہو گیا ہوگا۔“

”ہاں، اب تم دونوں بھی جا سکتے ہو، لیکن نہیں، ہم تم دونوں کے ہاتھ کر
 کے پیچھے باندھ کر یہاں سے جانے کی اجازت دیں گے۔ چلو بھئی باندھ دو ان کے
 ہاتھ کمر پر۔“

”ایک منٹ ابا جان۔“ اچانک محمود بول اٹھا۔ انہوں نے چونک کر محمود کی
 طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے محمود؟“

”ہم اس سرنگ سے نہیں جائیں گے۔“ محمود نے کہا اور دی سائٹ نے
 چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”ہم اس سرگ سے جائیں گے، جس سے آئے تھے اور یہ وہ سرگ نہیں

ہے۔“

”کیا؟“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ڈی سائٹ کا منہ بھی مارے

حیرت کے کھل گیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو محمود، یہ وہ سرگ نہیں ہے؟“ انسپکٹر جمشید کے لہجے

میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، آپ کو یاد ہے، سرگ سے نکلنے کے بعد میں گر پڑا تھا اور آپ

نے مجھے اٹھایا تھا۔“

”ہاں یاد ہے، پھر.....“

”پھر یہ کہ میں اپنا چاقو نکالنے کے لیے گرا تھا اور چاقو سے میں نے پتھر ملی

زمین پر ایک نشان بنایا تھا۔ وہ سرگ دراصل اس نشان کے سامنے ہے۔“

”اوہ۔“ وہ حیران رہ گئے۔

”تو کیا یہ غلط سرگ ہے؟“ خان رحمان بڑبڑائے۔

”جی ہاں، یہ ضرور دھوکے کی ٹٹی ہے۔“

”کیوں مسٹر ڈی سائٹ، میرا بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”ہاں، میں نے تم لوگوں کی ذہانت کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ تم

لوگ بلاوجہ مشہور نہیں ہو۔ واقعی یہ وہ سرگ نہیں ہے۔ یہ تو ایک قسم کا قید خانہ ہے۔ خیر،

میں اسے بند کیے دیتا ہوں اور وہ سرگ کھول دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ کر

دہانہ بند کر دیا۔ ساتھ ہی ایک دوسرا دہانہ کھل گیا۔

”اب تم سرگ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بھی بتاؤ، تاکہ ہم سرگ کے

اندر پہنچ کر دہانہ بند بھی کر سکیں اور قصبہ جالوم والی سمت میں پہنچ کر کھول بھی سکیں۔“

”آؤ میں بتاؤں۔“

”ہو شیار رہتا، صرف میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ سام لٹ، تم یہیں کھڑے رہو گے۔“

”اچھا۔“ سام لٹ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”ڈی سائٹ انہیں لے کر آگے بڑھ گیا۔“

”یہ دیکھئے گول پتھر۔ اس پر پورا ہاتھ رکھ کر گھمائیں تو دہانہ کھل جائے گا۔

اندر پہنچ کر جب اسی قسم کے گول پتھر کو الٹا گھمائیں گے تو دہانہ بند ہو جائے گا۔ اس پر

ہلکا سا دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے، زور نہیں لگانا پڑتا۔“

”شکریہ، پہلے صرف میں اندر جا کر دہانہ بند کر کے دیکھوں گا اور جب

اطمینان ہو جائے گا ہم تم دونوں کو جانے کی اجازت دے دیں گے۔“

”بہت محتاط ہو۔ اچھا یوں ہی سہی۔“ اس نے بے چارگی کے عالم میں

کندھے اچکائے۔

انسپکٹر جمشید اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا، دائیں طرف گول پتھر

موجود تھا۔ اسے الٹا گھمایا تو دہانہ بند ہو گیا۔ سیدھا گھمایا تو پھر کھل گیا۔

”ٹھیک ہے مسٹر ڈی سائٹ، اب تم دونوں جاسکتے ہو۔ پیچھے مڑ کر نہ

دیکھنا، ورنہ.....“

”ورنہ پتھر کے بن جائیں گے۔“ فاروق بول اٹھا اور وہ مسکرا دیے۔

دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے کھیتوں کی طرف جانے لگے۔

”جمشید کھیتوں کے قریب اسلحہ پڑا ہے۔ یہ دونوں رائفلیں اٹھا کر ہم پر

فائرنگ کر سکتے ہیں۔“ خان رحمان نے گویا خبردار کیا۔

”فکر نہ کرو، اس سے پہلے ہم انہیں گولیوں کا نشانہ بنادیں گے۔“
 ”لیکن ان دونوں نے رائفلیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ کھیتوں سے
 گزر کر آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔“

”اب ہم کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟“
 ”ہاں ٹھیک ہے۔ بس میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ہم اتنی آسانی سے
 آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“
 ”نظر تو یہی آتا ہے۔ ڈر ہے تو صرف یہ کہ کہیں اس میں ڈی سائٹ کی
 کوئی چال نہ ہو۔“

”آؤ، فی الحال تو کسی چال کا امکان نظر نہیں آتا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔
 اور پھر سب سرنگ میں داخل ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید نے گول پتھر گھما کر
 دہانہ بند کر دیا۔ سرنگ میں روشنی ہو گئی۔

”اب جس قدر تیز دوڑ سکتے ہو، دوڑو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔
 ”کیا مطلب، اب دوڑنے کی کیا ضرورت؟“ پروفیسر داؤد گھبرا کر
 بولے۔

”ڈی سائٹ اور سام لٹ جوئی محفوظ جگہ پہنچیں گے، فوجیوں کو واپس
 آ کر سرنگ پر حملے کا حکم دیں گے۔ اب اگر ایک پوری فوج سرنگ کا دہانہ کھول کر ہم پر
 حملہ کر دے تو ہم کیا کر سکیں گے۔“

”تو کیوں نہ دہانہ کھلنے اور بند ہونے کا نظام خراب کر دیا جائے، تاکہ وہ
 باہر سے اندر داخل ہی نہ ہو سکیں۔“

”اس میں دیر لگ سکتی ہے اور اس طرح ہم بھی خطرہ مول لیں گے۔“ وہ
 بولے۔

”گویا ہمیں دوڑنا ہی ہوگا۔“
 ”ہاں بالکل، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ انہوں نے کہا اور سب نے
 دوڑ لگا دی۔

”جج، جمشید، میں کیا کروں۔“ پروفیسر داؤد بولکھلا اُٹھے۔
 ”آپ فکر نہ کریں۔“

”واہ، کتنا اچھا نسخہ ہے۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا اسی وقت انسپکٹر جمشید
 نے جھک کر انہیں اپنے کندھے پر ڈال لیا اور دوڑنے لگے۔ اب وہ سب دوڑ رہے
 تھے۔ سرنگ کم لمبی نہیں تھی۔ دوڑ کر بھی اسے جلد عبور نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن اس کے سوا
 اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد فرزانہ چلائی:

”اباجان، دشمن سرنگ میں داخل ہو چکے ہیں اور وہ بھی دوڑ رہے ہیں۔“
 ”اوہ، اب ہمیں اور تیز دوڑنا ہوگا۔ اگر چہ درمیانی فاصلہ آدھ گھنٹے کا ہے،
 لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم رفتار کم کر دیں۔ ابھی تو شکر ہے کہ انہوں نے ہم تک
 آنے کے لیے موٹر سائیکلیں استعمال نہیں کیں۔ اس سرنگ میں موٹر سائیکلیں تو
 استعمال کی ہی جاسکتی تھیں۔ شاید ان لوگوں کی بھی عقلیں ماری گئی ہیں۔“

وہ اور تیز دوڑنے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے سرنگ کا دوسرا سرانظر آنے
 لگا۔ ان کی رفتار کم ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید نے پروفیسر صاحب کو نیچے اتار دیا اور بولے:

”میں سرنگ کا دہانہ کھول دوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہکھلائے۔

انسپکٹر جمشید دہانے کے قریب پہنچے۔ دائیں طرف انہوں نے گول پتھر کی
 تلاش میں نظریں دوڑائیں، لیکن یہاں کوئی گول پتھر نہیں تھا۔ اب انہوں نے بائیں
 طرف دیکھا، لیکن ادھر بھی کوئی گول پتھر نہیں تھا۔

مارشل لاء

چند لمحوں تک کوئی کچھ نہ بولا۔ آخر فاروق کی آواز سنائی دی:

”تو کیا اب ہمیں اس سرنگ میں لڑائی لڑنا ہوگی؟“

”ہاں، ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، لیکن اس لڑائی میں ہم ہر صورت میں نقصان میں رہیں گے۔ نہ تو ہم پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس اسلحہ نہ ہونے کے برابر ہے، گولیاں کب تک چلیں گی، جب کہ دشمن ہر طرح لیس ہے۔ ان کے لیے ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔“ خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہمت ہار دیں۔ خدا پر بھروسہ نہ کریں۔ خان رحمان مورچے سنبھال لو۔ میرا مطلب ہے، راکٹیں سنبھال کر سینے کے بل لیٹ جاؤ اور دشمن کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاؤ، کچھ بھی ہو، ہم بہادری کی موت مریں گے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”جمشید، تم بھی ان کا ساتھ دو۔ دہانہ میرے حوالے کر دو میں اسے کھولنے کا طریقہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”اچھی بات ہے، آئیے۔“ انہوں نے کہا اور باقی لوگوں کے ساتھ آٹے۔ سب کے سب سینے کے بل لیٹ گئے اور دشمن کا انتظار کرنے لگے، بس پرفیسر داؤد کھڑے رہ گئے۔ وہ دہانے کے دائیں بائیں، اوپر نیچے اور ہر طرف ہاتھ

”اف خدا، یہاں تو کوئی گول پتھر نہیں ہے۔“ انہوں نے کانپ کر کہا۔

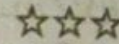
”سگ، کیا مطلب؟“ کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔

”مطلب یہ کہ یہ دہانہ کسی اور طرح کھلتا ہے۔“

”اوہ۔“ ان کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی انہوں نے دوڑتے قدموں کی

آواز نزدیک آتے محسوس کی۔

ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔



پھر رہے تھے۔ جگہ جگہ دباؤ ڈال رہے تھے۔ ادھر دوڑتے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”دشمن بہت نزدیک آ گیا ہے، ہوشیار ہو جاؤ، ہماری کوئی گولی خالی نہ

جائے۔“

”فکر نہ کریں ابا جان، ہم ان کے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوں

گے۔“ فرزانہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”پروفیسر صاحب، خطرہ سر پر آ پہنچا۔ اب آپ بھی لیٹ جائیں۔“

انسپکٹر جمشید کو ان کا خیال آیا۔

”میں کیسے لیٹ سکتا ہوں۔ اگر میں لیٹ گیا تو پھر ہم سب ہی لیٹے رہ

جائیں گے۔ سرنگ کا دہانہ کھلنے کی صورت میں ہی ہم بچ سکتے ہیں۔“

”آپ کی بات بھی ٹھیک ہے، لیکن کھڑے رہنے کی صورت میں آپ

شدید خطرے کی زد میں ہوں گے۔“

”اب ہم سبھی شدید خطرے میں گھر چکے ہیں جمشید، میری فکر چھوڑو،

دشمنوں کو نشانہ بنانے کی تیاری کرو۔“ انہوں نے نہ سکون آواز میں کہا۔

”اچھا، چلیے آپ کی مرضی۔ خان رحمان میرے بچو، مجھے افسوس ہے، میں

اس مرحلے پر تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ کاش ہم اس سرنگ میں

داخل نہ ہوتے۔ ہم کسی اور راستے سے اپنے ملک پہنچ سکتے تھے۔ وہ راستہ خطرناک تو

ضرور ہوتا، لیکن ہم میں سے کچھ ضرور بچ جاتے۔“ انہوں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”ابا جان، خدا کے لیے مایوسانہ باتیں نہ کریں۔ اس طرح ہمیں اپنا دل

بیٹھا محسوس ہوتا ہے۔“ فرزانہ بولی۔

”ہاں، جمشید، اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ مسلمان کو موت سے کیا ڈر۔“

خان رحمان بولے۔

ساتھ ہی انہوں نے دُور بہت دُور سرنگ میں دشمنوں کو دوڑ کر آتے دیکھ

لیا۔

”دشمن آ پہنچا، فائر۔“ خان رحمان بولے۔

انہوں نے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ بھاگتے دشمن منہ کے بل گرے اور ان

کے پیچھے آنے والے ان پر گرے۔ ان کی چیخیں سرنگ میں حد درجے عجیب لگیں۔

شاید اس لیے بھی کہ اس سے پہلے انہوں نے سرنگ میں کبھی جنگ نہیں لڑی تھی۔ دشمن

نے دم سادہ لیا۔ شاید انہیں یہ امید نہیں تھی کہ ان کا مقابلہ اس درجے دلیری سے کیا

جائے گا۔ وہ تو یہ خیال کیے بیٹھے تھے کہ ان کی کثیر تعداد اور بند سرنگ دیکھ کر یہ لوگ خود

کوان کے حوالے کر دیں گے۔

اب وہ بھی سب کے سب سینے کے بل لیٹ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں

سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر کھڑے ہوئے پروفیسر داؤد پر

پڑی۔ ان میں سے ایک نے لیٹے لیٹے ان کا نشانہ لیا، لیکن اسی وقت انسپکٹر جمشید کی

رائفل سے نکلنے والی گولی اسے چاٹ گئی۔ پروفیسر داؤد تو ادھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔

وہ تو بس سرنگ کا دہانہ کھولنے کی فکر میں تھے۔

”آگے بڑھو، رک کیوں گئے۔ تم ان چند آدمیوں سے ڈر گئے۔“ دشمن کی

طرف سے شاید ان کے کماٹر رنے کہا۔

ایسا لگا، جیسے وہ یک دم ہوش میں آ گئے ہوں۔ ان کی رائفلیں سیدھی

ہو گئیں، لیکن عین اسی وقت ادھر سے ہاڑہ ماری گئی۔ ایکبار پھر چیخیں گونج اٹھیں۔

ساتھ ہی دشمن نے بھی فائر کھول دیا۔

پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے انہیں لرزا کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی

انہوں نے ان کی آواز سنی:

”مم، مم، جمشید۔ میں نے۔“

اور ان کی آواز ڈوب گئی۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا ان کے جسموں سے ٹکرایا۔
مڑ کر جو دیکھا تو دہانہ کھلا تھا۔

☆☆

وہ اندھا دھند اٹھے اور دہانے کی طرف دوڑ پڑے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کو سب سے زیادہ فکر پروفسر داؤد کا تھا۔ ان کے گولی لگ چکی تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں بیروں میں کچلے جانے کے لیے نیچے پڑا رہنے دیا جائے، لہذا انہوں نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ان تک پہنچ گئے۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے انہیں بائیں کندھے پر ڈال لیا۔ اس وقت تک قید خانے سے ساتھ آنے والے قیدی سرنگ سے باہر چھلانگیں لگا چکے تھے۔

دوسرے ہی لمحے ان کی چیخوں نے فضا کو تھرا کر رکھ دیا۔ اس وقت تک وہ بھی سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے فوراً خود کو گرا دیا اور رینگ کر سرنگ سے نکل آئے۔

”باہر بھی دشمن موجود ہے خان رحمان اور سرنگ کے اندر بھی۔“
انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

”اور باہر یقیناً اکبر بھورانی کے ساتھی موجود ہیں۔ ڈی سائٹ نے پہلا کام اکبر بھورانی کو فون کرنے کا کیا ہوگا۔“ فرزانہ بولی۔

”ہاں، بالکل سچی بات ہے۔“

وہ رینگتے ہوئے دائیں طرف مڑ گئے۔ دونوں طرف کے دشمنوں سے بچنے کا بس یہی طریقہ تھا۔ انسپکٹر جمشید جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتے تھے، کیونکہ

انہوں نے محسوس کر لیا تھا۔ پروفسر داؤد ابھی زندہ ہیں اور انہیں فسطائی کی ضرورت تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی انہوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی اور ڈی سائٹ کے فوجی دہانے پر نمودار ہوئے، لیکن گولیوں کی بو چھاڑنے ان کے پرچھے اڑ دیے۔ اکبر بھورانی کے ساتھیوں نے ڈی سائٹ کے فوجیوں کو نشانہ بنا ڈالا تھا۔ اب انہیں کیا معلوم تھا کہ اندر دونوں گروہ نزدیک آ گئے تھے۔

”خان رحمان، موقع اچھا ہے۔ صورت حال دلچسپ ہو گئی ہے۔ ہم موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے دُور نکل سکتے ہیں۔ ڈی سائٹ نے اکبر بھورانی کو فون پر بھی بتا دیا ہوگا کہ ہم لوگوں کے ساتھ بہت سے قیدی بھی فرار ہو گئے ہیں۔ تم لوگ یہ جان کر خوش ہو گے کہ پروفسر داؤد زندہ ہیں اور میرا خیال ہے، زیادہ زخمی بھی نہیں ہیں۔“

”شکر ہے خدا کا۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔

”اور اکبر بھورانی کے آدمی سرنگ سے نکلنے والوں کو قیدی ہی خیال کر رہے ہیں۔“ فاروق مسکرایا۔

وہ رینگتے ہوئے اس جگہ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ سرنگ کے پاس ابھی تک فارنگ ہو رہی تھی اور اس فارنگ پر وہ بار بار مسکرا رہے تھے۔ فاروق کے تو ہر بار دانت لٹکے پڑ رہے تھے۔

”بھئی، اب اتنے بھی دانت نہ نکالو، کہیں باہر ہی نہ گر پڑیں۔“ فرزانہ نے جمل کر کہا۔

”میرے دانت مصنوعی نہیں ہیں۔“ فاروق نے منہ بتایا۔

”تب خدا کا شکر ادا کرو۔“ محمود ہنسا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے معنوی دانت عطا نہیں کیے۔“ فاروق بولا اور وہ مسکرانے لگے۔ گولیوں کی آوازاں لہجہ بہ لہجہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔ یعنی وہ سرنگ سے بہت دور نکل آئے تھے۔

اب انہوں نے پروفیسر داؤد کو لٹا کر دیکھا۔ ان کے دائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی بازو پر رومال وغیرہ باندھ دیا اور پھر چلنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ بعد پروفیسر داؤد نے آنکھیں کھول دیں۔

”جشید، میں زندہ ہوں؟“

”آپ سو فیصد زندہ ہیں۔ معمولی سے زخم آئے ہیں۔“

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“

”لیکن آپ نے دہانہ کس طرح کھول لیا؟“

”دواغ قطر کا ایک گڑھا نظر آیا تھا۔ میں نے اس میں ہاتھ ڈال کر دباؤ ڈالا ہی تھا کہ گولی میرے بازو میں لگی اور میں گر گیا، تو کیا دہانہ کھل گیا تھا؟“ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، آپ کی چیخ سن کر ہم نے آپ کی طرف دیکھا تو دہانہ کھلا نظر آیا۔“ خان رحمان بولے۔

”چلو شکر ہے، مجھے اپنے زخمی ہونے کا کوئی افسوس نہیں۔“ پروفیسر داؤد خوش ہو گئے۔

”میں چاہتا ہوں، جلد از جلد قصبے میں پہنچ کر آپ کو ہسپتال میں داخل کرادوں۔ اس کے بعد ان لوگوں کی طرف توجہ دوں۔“

”تو کیا تم ان لوگوں کو یہیں لڑتے بھڑتے چھوڑ جاؤ گے؟“ پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

”اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت مناسب بھی کیا ہے۔ انہیں آپس میں ہی لڑنے دیا جائے۔ آپ کو ہسپتال میں چھوڑ کر ہم فوج کی مدد حاصل کریں گے۔“ انہوں نے کہا۔

نہ جانے انہیں کب تک پیدل چلنا پڑا۔ آخر خدا خدا کر کے ایک ٹیکسی ملی اور وہ اس میں لد پھند کر ہسپتال پہنچے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اعتراض بھی کیا کہ اس کا چالان ہو جائے گا، لیکن انہوں نے چالان کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس وقت پروفیسر داؤد کے زخم کا نازک مسئلہ درپیش تھا، ایسے میں وہ چالان کی کیا پروا کرتے۔ ان کے بازو سے خون کا بہنا بند نہیں ہو سکا تھا۔ انہیں ڈاکٹروں کے حوالے کر کے وہ اسی وقت سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیپٹن ارشاد نے انہیں دیکھ کر حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں، پھر بولا:

”معلوم ہوتا ہے، آپ تمام کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں۔“

”نہیں کیپٹن صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو ذرا دشمن ملک تک ہو کر آ رہے ہیں۔“

”جی، کیا فرمایا۔ دشمن ملک تک؟“ اس کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

”ہاں، آپ کے جانے کے بعد ہم پر غنی افتاد آ پڑی تھی۔“ انہوں نے کہا اور تفصیل سنا دی۔ کیپٹن ارشاد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”اف خدا، یہ میں کیا سن رہا ہوں۔“

”وہی جو حقیقت ہے۔ ہم نے آپ کو کسی مہناتی ناول کا کوئی حصہ پڑھ کر نہیں سنایا۔“ فاروق بولا اور خان رحمان مسکرا دیے۔

”پھر اب کیا پروگرام ہے؟“

”آپ اپنے دستے کو لے کر ہمارے ساتھ چلیے۔ لیکن اس سے پہلے اپنے

آفسر کو تمام حالات سنا دیجیے۔ تاکہ وہ فوری طور پر اس سرحد پر بھاری تعداد لے آئیں۔ کیا خبر دشمن ملک جھلاہٹ میں حملہ ہی کر دے۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ اس نے کہا اور فون کرنے چلا گیا۔ دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

”فون کر دیا ہے۔ ابھی سب انتظامات ہو جائیں گے۔ ہم آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔“

”شکریہ۔“ انہوں نے کہا اور پھر فوج کے دستے کے ساتھ وہ پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں اب مکمل طور پر خاموشی طاری تھی۔ سرنگ کے دہانے کے قریب اور ادھر ادھر لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سرنگ کا دہانہ کھول کر دیکھا گیا۔ اندر بھی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

”اس سرنگ کو بھی بند کرنا ہوگا۔“ انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔
 ”فکر نہ کیجیے۔ سب سے پہلا کام ہی یہ کیا جائے گا۔ بریگیڈیر صاحب خود تشریف لا رہے ہیں۔ وہ یہ کام اپنی نگرانی میں کرائیں گے۔“
 ”اس کے علاوہ ایک اور بہت ضروری کام کرنا ہے۔ بریگیڈیر صاحب آئیں تو میں انہیں تفصیلات بتا دوں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”وہ کیا کام ہے؟“ کیپٹن ارشاد نے پوچھا۔
 ”اس قصبے پر مارشل لاء نافذ کرنا ہوگا۔ لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا ہوگی کہ اکبر بھورانی اس قصبے کا حاکم ہے۔“
 ”اوہ ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔“ اس نے کہا۔

دو گھنٹے بعد بریگیڈیر صاحب پہنچے۔ وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں مبارک باد دی کہ دشمن ملک سے فک کر نکل آئے تھے۔ انہوں نے تمام تفصیلات

آپس میں بیٹھ کر طے کیں۔..... طے یہ پایا کہ مارشل لاء مہینے کی آخری تاریخ کو لگایا جائے گا۔ یعنی اکبر بھورانی کے اجلاس کے بعد۔

☆☆☆

مصرعہ

دو دن انہوں نے ایک ہوٹل میں گزارے۔ ان کا زیادہ وقت ہسپتال میں کٹا۔ پروفیسر داؤد اب بہت بہتر تھے۔ اس دوران محمود، فاروق اور فرزانہ شدید الجھن کا شکار رہے۔ انہوں نے کئی بار اکبر بھورانی کے بارے میں پوچھا۔

”ابا جان، ان تمام حالات کے بعد بھلا اکبر بھورانی وقار منزل میں اجلاس کیوں طلب کرنے لگا۔“

”اگر وہ وقار منزل میں اجلاس نہیں بلائے گا تو کہیں اور بلائے گا، بلائے گا ضرور۔“

”لیکن ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ اجلاس کہاں ہو رہا ہے؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”یہ کیا مشکل ہے۔ نور دین موچی، ساردم وغیرہ یہاں موجود ہیں۔ یہ لوگ اکبر بھورانی کے خاص آدمی ہیں۔ اجلاس میں ضرور شرکت کریں گے۔ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے اجلاس کی جگہ تک پہنچ سکتے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”اور اگر ان لوگوں کو حالات کی نزاکت کی وجہ سے نہ بلایا گیا تو۔“ فاروانی نے اعتراض کیا۔

”تب بھی ہم اجلاس کی جگہ ضرور معلوم کر لیں گے۔ میری نظروں میں کچھ اور لوگ بھی ہیں، جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اکبر بھورانی گروہ کے آدمی

ہیں۔“

”اور وہ کون لوگ ہیں، کیونکہ عرفان غازی مارا جا چکا ہے اور کوئی آدمی ہمیں ایسا نظر نہیں آتا۔“ محمود نے الجھ کر کہا۔

”تمہیں چاہیے، آنکھیں کھلی رکھا کرو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”لیکن اس کیس کے دوران ہمیں آنکھیں بند کرنے کا موقع ہی کہاں ملا ہے ابا جان۔“ فاروق بولا۔

”آج دس بجے ہمیں اجلاس کی جگہ پہنچنا ہے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ کیس کے دوران تم سوتے رہے ہو یا جاگتے۔“ انہوں نے پراسرار لہجے میں کہا۔

”آپ تو ہمیں اور بھی الجھن میں مبتلا کر رہے ہیں۔“ فاروق نے بے چین ہو کر کہا۔

”تم ہی کیا، میں بھی الجھن کا شکار ہو کر رہ گیا ہوں۔“ خان رحمان بولے اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

ساڑھے نو بجے کے قریب وہ اپنے ہوٹل سے نکلے۔ اسی وقت ان کی نظر ایک جانے پہچانے آدمی پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا، جس کی ٹیکسی میں سفر کر چکے تھے۔ جس کے ساتھ ان کی کافی دیر تک بات چیت ہوئی تھی۔

”ہاں بھئی، کیا حال ہے؟“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”اوہو، یہ آپ لوگ ہیں۔ خدا کا شکر ہے، فرمائیے کہاں کا ارادہ ہے؟“

”بس ذرا ایک دو جگہ جائیں گے۔“

”میری ٹیکسی حاضر ہے۔“

”شکریہ، اسی لیے تو ادھر آئے ہیں۔“ انہوں نے کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ

گئے۔

”ہم آپ کا نام پوچھنا بھول گئے تھے۔“ نام بتانا پسند کریں گے۔“

”کیوں نہیں، اس میں کیا حرج ہے۔ مجھے عادل کہتے ہیں۔“

”آپ نے بتایا تھا، آپ کو اکبر بھورانی سے نفرت ہے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“

”تو پھر آج ہم اکبر بھورانی کا جھگڑا اس قصبے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم

کرنے جا رہے ہیں۔ شاید آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی۔“

”اوہو، یہ تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے، پھر تو مجھے بھی اپنے ساتھ

رکھیں۔“

”بھئی یہ مشکل ہے، کیونکہ یہ کام جان جو کھوں کا ہے۔“

”پھر کیا ہوا۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”خیر، جیسے تمہاری مرضی۔“ انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

”نور دین موچی کے گھر چلتا ہے، لیکن ٹیکسی کچھ دور ہی روک لینا۔ ہم ذرا

دور رہ کر جائزہ لیں گے۔“

”اچھا۔“ اس نے کہا اور ٹیکسی چلا دی۔

پندرہ منٹ بعد وہ نور دین موچی کے گھر کے سامنے موجود تھے۔

”مسٹر عادل، آپ کو ایک تکلیف دوں گا۔ ذرا کسی پبلک فون بوتھ سے

نور دین موچی کو فون تو کریں۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ گھر میں ہے یا

نہیں۔“

”لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دستک دے کر بھی تو یہ بات معلوم

کر سکتے ہیں۔“

”نہیں بھئی، ہمیں ذرا پردے میں رہنا ہے۔“

”جی بہتر، میں ابھی فون کر کے آتا ہوں۔“ اس نے کہا اور ٹیکسی سے اتر

کر چلا گیا۔

”آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟“ محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میرا خیال تھا، اجلاس وقار منزل کی بجائے نور دین موچی کے گھر میں

ہوگا، لیکن یہاں تو لوگوں کی آمد و رفت کے کوئی آثار نہیں ہیں۔“ انہوں نے پریشان

ہو کر کہا۔

”پھر اب کیا ہوگا؟“

”کوئی بات نہیں۔ ہم اجلاس کی جگہ تلاش کر لیں گے۔“ وہ بولے۔

تین منٹ بعد عادل واپس آتا نظر آیا۔ آتے ہی بولا:

”وہ گھر میں نہیں ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ آپ کو وقار منزل کے بارے میں معلوم ہے؟“

”ہاں، ہے تو سہی۔“

”کیا یہ عمارت کسی وقار نامی آدمی کی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ ہو سکتا ہے، کسی زمانے میں رہی ہو۔ اب تو وہ عمارت ہوٹل

گنار کے مالک ساروم کی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوہ۔“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”تب تو آپ وقار منزل ہی چلیں۔ اجلاس ضرور وہیں ہوگا۔ اکبر بھورانی

اب تک اس خوش فہمی میں ہوگا کہ قصبے میں حکم تو اسی کا چلتا ہے، ہم لوگ بھلا اس کا کیا

بگاڑ لیں گے۔“

”ضرور یہی بات ہے ابا جان۔“ فرزانہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، اب ہم وہیں چلیں گے۔“

”میں منٹ بعد عادل نے انہیں وقار منزل کے پاس پہنچا دیا۔ یہ شہری آبادی سے الگ تھلگ عمارت تھی۔ اس کے چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ مکان کے ارد گرد کاریں ہی کاریں کھڑی تھیں۔ کاروں کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید بولے:

”بس ٹھیک ہے، انہوں نے اجلاس کی جگہ تبدیل نہیں کی۔ بہت دیر لوگ ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

”آپ ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”بریگیڈیئر صاحب کو دیکھ رہا ہوں۔ انہیں اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے

تھا۔“

”تو کیا وہ پہلے نور دین موچی کے گھر کی طرف نہیں جائیں گے؟“

”کیپٹن ارشاد اکیلا جا کر جائزہ لے گا اور بریگیڈ۔۔۔ اب لو اطلاع دے

گا۔ اس صورت میں بھی انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ خیر، آتے رہیں گے۔ اب ہم اور نہیں رک سکتے۔ آؤ بھی چلیں۔“

وہ آگے بڑھے۔ عمارت کے دروازے پر کوئی نگران نہیں تھا۔ دروازہ اندر سے بند ملا، چنانچہ وہ چکر لگا کر پچھلی طرف پہنچے۔ کئی درخت عمارت کی منڈیر کو چھو رہے تھے۔

”فاروق کو ہی نہیں، ہم سب کو اسی طرف سے جانا ہوگا، تاہم ہم بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیں گے تاکہ بریگیڈیئر صاحب کو وقت نہ ہو۔“

”چلو بھی محمود، آج صرف مجھے درخت پر نہیں چڑھنا۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

”بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”اس ضرب المثل کا یہاں کیا موقع؟“ فاروق نے بھنا کر کہا۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔“ فرزانہ نے کہنا چاہا، لیکن انسپکٹر جمشید نے ڈانٹ

دیا۔

”بس بس، ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔“

”اوہ، ہمیں افسوس ہے ابا جان۔“ فرزانہ نے سہم کر کہا اور سب لوگ درخت پر چڑھنے لگے۔

جب سب لوگ چھت پر پہنچ گئے تو زینے کا رخ کیا گیا۔ زینے کا دروازہ بند نہیں ملا۔ یہ دیکھ کر محمود ٹھنک گیا۔

”کہیں ہم لوگوں کے لیے جال تو نہیں بچھا دیا گیا، کیونکہ یہ بات تو ان لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے کہ ہم ان کی قید سے نکل آئے ہیں۔“

”پروانہ کرو، بچھالنے دو انہیں جال۔ اب ان کے ہر جال کے تار تار ہونے کا وقت آچکا ہے۔ انہیں نہیں معلوم، ہم فوج کو قبضے میں لے آنے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ اکبر بھورانی کا خیال یہ ہوگا کہ مارشل لاء تو بس پورے ملک میں لگ سکتا ہے، لیکن ہم اسے جزوی مارشل لاء کہتے ہیں، جو اشد ضرورت کے تحت لگایا جاسکتا ہے اور پھر حالات معمول پر آنے کے بعد اٹھالیا جاتا ہے۔“

”پھر بھی، کیا اکبر بھورانی اتنا ہی بے وقوف ہے۔“

”بعض لوگ طاقت کے نشے میں بے وقوف ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال ہوگا دشمن ملک اس کی پشت پر ہے۔ ہم لوگ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، آؤ۔“

وہ دبے پاؤں میڑھیاں اترنے لگے۔ عمارت کے درمیان میں ایک کمرے سے ایک آواز ابھرتی سنائی دی۔ وہ اس طرف قدم اٹھانے لگے، پھر خیال

اُسے پرک گئے اور انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی:

”محمود، دروازہ کھول آؤ۔“

”جی بہتر۔“ وہ چلا گیا۔ جلد ہی واپس آیا اور سر کے اشارے سے بتایا کہ

دروازہ کھول آیا ہوں۔

اب وہ اس کمرے کے دروازے تک پہنچے۔ کمرے میں ابھرنے والی آواز اب انہیں صاف سنائی دینے لگی۔ کوئی کہہ رہا تھا:

”آپ لوگ حیران نہ ہوں، میں نے انتظام کر رکھا ہے، وہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، جوں ہی وہ اندر داخل ہوں گے، انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس ماہ بھی ہماری کارگزاریاں قابل تعریف ہیں۔ آئندہ ماہ آپ لوگوں کو کچھ نئی ہدایات اور نئے احکامات ملیں گے، کیونکہ صرف ایک قصبے پر قبضہ کچھ مزے دار بات نہیں۔ ہر شہر پر ہمارا قبضہ ہونا چاہیے۔ عنقریب قدم اٹھایا جانے والا ہے۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے دروازے پر ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ انہوں نے دیکھا، وہ ایک ہال نما کمرے کے دروازے پر موجود تھے۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ ان سب کرسیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک گول سی میز موجود تھی۔ اس میز پر ایک چھوٹا سا سپیکر نصب تھا۔ اسی وقت سپیکر سے ایک آواز ابھری:

”تو آپ لوگ آہی پہنچے۔ ہمیں بھی آپ کا انتظار تھا۔ خوش آمدید، لیکن آپ لوگوں نے یہاں آکر غلطی کی۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے، یہاں اس قصبے کی انتظامیہ کا اجلاس ہو رہا ہے اور اس اجلاس میں عام لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت نہیں، لہذا اس جرم کی پاداش میں آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ ڈی ایس پی صاحب، ان لوگوں کے ہاتھوں میں جھکڑیاں لگا دیجیے۔“

”پھر جھکڑیاں۔“ فاروق نے سرد آہ بھری اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اسی وقت کمرے میں کچھ اور لوگ داخل ہوئے۔ انہوں نے مذکورہ دیکھا، پولیس کے تقریباً بیس آدمی ان کے پیچھے موجود تھے اور ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

”یہ اس قصبے کے امن کو تباہ کرنے کے مجرم ہیں۔ انہیں گرفتار کر کے لے جایا جائے۔“

”تمہارے کرتادھرتا ڈی سائٹ، سام لٹ اور غوربان وغیرہ تو ہمیں قید میں رکھ نہیں سکے، ہمارے اپنے ملک کی پولیس بھلا کس طرح گرفتار کر سکے گی۔“ انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”سن رہے ہیں ڈی ایس پی صاحب۔“ آواز ابھری۔

”ہاں جناب، آپ فکر نہ کریں۔ چلو بھی لگا دو جھکڑیاں۔“ ڈی ایس پی نے کانٹیلوں سے کہا۔

”ٹھہریے ڈی ایس پی صاحب۔ پہلے اس اجازت نامے پر نظر ڈال لیجیے اور اگر آپ نے اس اجازت نامے کی حیثیت کو تسلیم نہ کیا تو یہ آپ کی بد قسمتی ہوگی۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا اور اپنا خصوصی اجازت نامہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے اسے پڑھا، ایک لمحے کے لیے بوکھلایا اور پھر منہ بنا کر بولا:

”یہ تو صدر مملکت کا اجازت نامہ ہے۔ آپ ملک کے کسی بھی معاملے میں دخل اندازی کر سکتے ہیں، لیکن اس قصبے پر ملک کے صدر کا حکم نہیں چلتا۔“

”تب آپ بد قسمت ہیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”جھکڑیاں لگا دو انہیں۔“

کانٹیل ان کی طرف بڑھے۔ اسی وقت ایک تیز آواز ابھری:

”ٹھہرو بھی، ایسی بھی کیا جلدی ہے، ان لوگوں کو جھکڑیاں نہیں لگا

جاسکتیں۔“

سب لوگ چونک کر مڑے۔ وہاں بریگیڈیر صاحب کھڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے فوجی جوان چوکس کھڑے نظر آئے۔

”آپ۔ آپ۔ آپ لوگ شہری معاملات میں مداخلت کرنے کیسے چلے آئے۔ آپ کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ جائے اور سرحدیں دیکھیے۔“ ڈی ایس پی نے منہ بتایا۔

”سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے، ملک میں کس جگہ کوئی ناسور ابھر رہا ہے اور کہیں سول انتظامیہ اس ناسور کو پھیلنے پھولنے کا موقع تو نہیں دے رہی۔ اگر ایسی کوئی بات نظر آئے، تو ہم شہری معاملات میں مداخلت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی صورت حال ایسی ہی ہے، لہذا ہم آپ سب کو گرفتار کر رہے ہیں۔“

”آپ ان لوگوں کو سنبھالیے، میں ذرا کبر بھورانی کی خبر لیتا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”ٹھیک ہے۔“

”آپ لوگ اپنے حق میں کانٹے بورے ہیں۔“ لاؤڈ سپیکر پر آواز

ابھری۔

”وہ کس طرح؟“ انسپکٹر جمشید سکرانے۔

”میرے ایک اشارے پر پڑوسی ملک کی فوج اس قصبے پر حملہ کر دے گی۔“

اس صورت میں آپ کا یہ فوجی دستہ کیا کر سکے گا۔“

”اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ ہم کمزور نہیں ہیں۔ یہ قصبہ دشمن کے قبضے میں دینے کی بجائے باقاعدہ جنگ لڑنے کے لیے تیار ہیں، آواز دوا اپنے ناخداؤں

انسپکٹر جمشید غرائے۔

۔۔۔

”بہت اچھا۔ اب تم لوگوں کا انجام بہت بھیانک ہو گا۔“

۱۷۱

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید درمیانی منزل سے کمرے کی طرف بڑھے۔ وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ اصل مجرم کس جگہ موجود ہو سکتا ہے۔ رات کو پہلے ہی گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، اندر مجرم بیٹھا تھا۔ میز پر اس کے سامنے ایک ماسک لگا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

”یہ۔ یہ کون ہے ابا جان۔“ محمود بولا۔

”اس کا نام تیمور ایاز ہے۔ پچیس سال پہلے اکبر بھورانی کی دھمکی سب سے پہلے اسی شخص کو ملی تھی۔ دھمکی نے کریم پولیس کے پاس گیا تھا، مگر پولیس اس دھمکی مذاق سمجھی، پھر اسے تین دھمکیاں اور ملیں اور اس کے کارخانے کو آگ لگ گئی، پھر اسے سبھ الغاریہ کو دھمکی ملی تو اس نے فوراً ہی مطالبہ مان لیا اور توردین موچی کو رقم دے دی۔ اس طرح اس کا کارخانہ جلنے سے محفوظ رہا۔ سب لوگ تیمور ایاز کو بد قسمت مانتے رہے۔ اکبر بھورانی کا پہلا شکار سمجھے رہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ تو خود بھورانی ہے۔ خود کو ہر شے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے یہ چال چلی تھی۔“

”تو، تو یہ اس ٹیکسی ڈرائیور کا باپ ہے۔“

”ہاں، اس بے چارے کو کیا معلوم کہ میرا باپ کون ہے، کیا ہے۔“

”اے اللہ۔“ فرزانہ کے منہ سے لگا۔

”تم جانی کے دروازے پر دستک دے چکے ہو جمشید، ایک بڑے ملک کو

دیکھا جائے گا۔ اپنے ملک کا ایک پورا حصہ بھی لوٹاؤں کے قبضے میں آجائے گا۔“

دیا جاسکتا۔ یہ تو پورا ملک دشمن کے قبضے میں دے دینے کے برابر ہوگا۔“

اور ان کے ساتھ آنے والے چند فوجیوں میں سے دو آگے بڑھے اور انہوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں نیچے اس کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا، لیکن وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔ خوش و خرم اور بے فکر تھے۔

”اباجان، یہ اتنے بے فکریوں ہیں؟“

”ان کا خیال ہے، ان کا ساتھی ملک ابھی حملہ کر دے گا اور انہیں چھڑا لے گا۔ ہم جنگ بند کرنے کے سلسلے میں اس کی ہر شرط مان لیں گے، لیکن یہ بے چارے خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، کوئی گئی گزری قوم نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ڈی ایس پی کی طرف مڑے۔

”مسٹر ڈی ایس پی، آپ کیا کہتے ہیں۔ خاموشی سے اپنی ڈیوٹی پر جانا پسند کریں گے یا اکبر بھورانی کا ساتھ دیں گے۔“

”مم، میں۔ میں۔“ وہ ہکا کر رہ گیا۔

”جائیے اور اپنی ڈیوٹی سنبھالیے۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اب اکبر بھورانی کا دور ختم ہو چکا ہے اس قصبے میں اب کبھی اس کا حکم نہیں چل سکے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

سب لوگوں کو گرفتار کر کے ملٹری کی حوالات کی طرف روانہ کر دیا گیا، پھر وہ اپنے ہتھکڑیوں کی طرف روانہ ہوئے۔

”اباجان، ابھی ہمیں دارالحکومت جا کر اس غدار انسپکٹر کو بھی قانون کے حوالے کرنا پڑے گا۔“ فرزانہ نے گویا دلدلایا۔

”ہاں، مجھے یاد ہے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔ فوجیوں تک ان غلط فلموں کو پہنچنے سے روکنا ہے، منشیات کا طوفان روکنا ہے اور انتظامی ڈھانچے کو پاک کرنا

ہے۔“ انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

اسی شام وہ واپس دارالحکومت جا رہے تھے۔ ایرپورٹ پر انہیں اطلاع ملی کہ پڑوسی دشمن ملک نے ملک کی سرحدوں پر بے تحاشا فوج جمع کر دی ہے، گویا وہ کسی وقت بھی اعلان جنگ کر سکتا تھا یا اعلان کیے بغیر ہی جنگ چھیڑ سکتا تھا۔

”اب۔ اب کیا ہوگا اباجان؟“

”زندہ قوموں کو اپنے وطن کی حفاظت کرنے کے لیے جنگیں لڑنا ہی پڑتی

ہیں۔“

وہ دارالحکومت پہنچے۔ ابھی گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ بیگم جمشید نے

انہیں بتایا:

”صدر مملکت بہت پریشان ہیں، وہ آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔“

”آؤ بھئی، صدر صاحب سے بھی مل آئیں۔“ وہ مسکرائے۔

ایوان صدر پہنچے تو انہیں بے تابی کے عالم میں ٹھٹھکتے پایا۔ ان کے مشیر بھی ان کے ساتھ ساتھ ٹھٹھکتے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر رک گئے۔ صدر صاحب کا نپتی آواز میں بولے:

”جمشید، تم نے یہ کیا کیا۔ پوری قوم پر جنگ مسلط کر دی۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں سر، میں نے مسلط کر دی؟“ انسپکٹر جمشید نے

حیران ہو کر کہا۔

”ہاں جمشید، تم نے اور صرف تم نے۔“

”وہ کیسے سر؟“ وہ پرسکون آواز میں بولے۔

”دشمن ملک کا کہنا یہی ہے۔ جانتے ہو، اس کا مطالبہ کیا ہے؟“

”بھلا میں کس طرح جان سکتا ہوں۔“

”ان کا مطالبہ یہ ہے کہ تمہیں اور تمہارے بچوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اکبر بھورانی نامی آدمی کو رہا کر دیا جائے اور قصبہ جالوم سے فوج بالکل ہٹائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس قصبے پر اپنا قبضہ چاہتے ہیں۔“

”پہلے آپ مجھ سے تمام حالات سن لیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اس مہم میں پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی ہمارے ساتھ تھے، بلکہ پروفیسر بے چارے تو زخمی بھی ہو گئے۔“

”اوہو اچھا۔“ ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

”جی ہاں، میں شروع سے عرض کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے پوری تفصیل سنادی۔ صدر صاحب کی حیرت اور پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ تمام باتیں دہرانے کے بعد انہوں نے کہا۔

”ایک طرح سے قصبہ جالوم پر تو وہ پہلے ہی بہت عرصے سے قابض چلے آ رہے تھے اور اس ناجائز اور خفیہ قبضے کی وجہ سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے رہے تھے، لہذا اب صرف یہ فرق پڑ گیا ہے کہ وہ اب ہمیں بھی قیدی بنانا چاہتے ہیں تاکہ اپنے ناپاک منصوبوں پر آسانی سے عمل کر سکیں۔ اب اگر آپ یہ سب کچھ پسند کرتے ہیں تو ہم اسی وقت دشمن کی قید میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ باقی رہا قصبہ جالوم کا معاملہ، وہ پہلے ہی ان کے قبضے میں تھا۔ اب باقاعدہ ان کے قبضے میں چلا جائے گا۔ میں نے تو ان کا قبضہ ختم کیا ہے۔ جہاں تک جنگ مسلط کرنے کا الزام ہے، وہ تو پوری دنیا پر مسلط ہے۔ کسی وقت بھی تیسری عالم گیر جنگ شروع ہو سکتی ہے اور اس جنگ میں ہمیں ہر حال میں شامل ہونا پڑے گا اور وہ جب بھی شروع ہوگی، قصبہ جالوم جیسے کسی چھوٹے سے معاملے سے ہی شروع ہوگی۔ آپ اس جنگ کو روک لیں۔ قصبہ ان کے حوالے کر دیں۔ ہم بھی ان کی قید میں چلے جائیں گے، پھر کیا ہوگا، وہ ایک

قصبے کے بعد دوسرے قصبے پر دانت بھادیں گے۔ ہم سرنگ سے نکل آنے کے بعد سے یہاں آ جاتے اور بھورانی کو کچھ نہ کہتے تو حالات اور بھی نازک اختیار کر لیتے۔ دشمن ملک وہی نازک حالات پیدا کرنے کے تو خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے تو اس کے خواب کو چکنا چور کیا ہے۔ اس پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ اگر آپ کو میرا یہ کام پسند نہیں آیا تو آپ اسی وقت کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں، ابھی تو کچھ بھی نہیں بگاڑا۔“ یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ ان کی جذباتی آواز نے ایک جادو سے اطاری کر دیا تھا۔ صدر صاحب بھی سکتے کی حالت میں بیٹھے رہ گئے۔ آخر انہوں نے کہا:

”مجھے ان تمام حالات کا علم نہیں تھا جمشید، تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ان حالات میں ہمیں جنگ سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ دشمن اگر جنگ چھیڑتا ہے تو شوق سے چھیڑے۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ قوم اسے منہ توڑ جواب دے گی انشاء اللہ۔ مجھے تم پر فخر ہے جمشید۔ تمہارے بچوں اور دوستوں پر بھی فخر ہے۔ یہ قوم تمہارے احسانات کبھی نہیں بھلا سکتی۔“

”شکریہ۔“ انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

اس شام ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔ ملک کا بچہ بچہ اٹھ کھڑا ہوا اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ فضا قومی ترانوں سے تھرانے لگی۔ سرحدوں پر ایسا جوش اور ولولہ دیکھنے میں آیا جس کی مثال نہیں مل سکتی، لیکن فوجوں کو حکم تھا کہ پہل ہرگز نہ کریں۔ فوجیں دشمن ملک کے حملے کا بے چینی سے انتظار کرتی رہیں۔ ایک شام انسپکٹر جمشید گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اتفاق سے اس روز انہوں نے پروفیسر داؤد کو غسل صحت منانے کی خوشی میں دعوت بھی دے رکھی تھی۔ خان رحمان اور ان کے بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب بھلا

شائستہ کے بغیر کس طرح آسکتے تھے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کے چہرے پر دل کش مسکراہٹ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”خیر تو ہے جمشید، یہ مسکراہٹ کس خوشی میں؟“

”آپ کے غسلِ صحت کے ساتھ آپ لوگوں کیلئے میں ایک خوشی خبری بھی

لایا ہوں۔“

”خدا کا شکر ہے اور بے پناہ خوشی کی بات ہے کہ آپ خوشی کی خبر لے کر

آئے ہیں۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”اور خوشی کی خبر یہ ہے کہ دشمن ملک کی تمام فوجیں سرحدوں سے پیچھے ہٹتی

جارعی ہیں۔“

”کیا مطلب، یہ کیا بات ہوئی۔ وہ تو بہت طمطراق سے آیا تھا اور بڑے

مطالبے منوانے کے موڈ میں تھا۔“

”ہاں، لیکن ہمارے ملک نے اس کا ایک مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا

اور اب وہ فوجیں پیچھے ہٹا رہا ہے۔“

”گویا اس نے حملے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں، بالکل یہی بات ہے۔“

”اس نے ایسا کیوں کیا آخر۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”دراصل حملہ کرنے کا ارادہ تو اس کا شروع میں ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس گیدڑ

بھکی دے رہا تھا کہ اگر چل گئی تو ٹھیک، ورنہ پیچھے ہٹ جائے گا۔“

”اوہ۔“ ان کے منہ سے نکلا اور پھر ان کے چہروں پر مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔

”اس موقع پر ایک مصرعہ کہا جاسکتا ہے۔ اگر سب لوگوں کو اعتراض نہ ہو

تو عرض کر دوں۔“ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

”ضرور ضرور۔“ خان رحمان اور پروفیسر داؤد پر جوش انداز میں بولے۔

شائستہ، حامد، سرور اور تاز نے تو تالیاں بجا کر منظوری دی۔

”اوٹ پٹانگ ہی ہوگا، شرطیہ کہہ دیتی ہوں۔“

”بلکہ بے وقت کی بانسری ہوگی۔“ محمود بولا۔

”بھئی پہلے سن تو لو۔“ خان رحمان بے تاب ہو کر بولے۔

”اور کیا؟“ پروفیسر داؤد نے جلدی سے کہا۔

”نو سنئے۔ عرض کیا ہے، گیدڑ بھکیوں سے ڈرنے والے اے آسمان نہیں

ہم۔“ اس نے کہا۔

اور سب کے سب مسکرا اٹھے۔ محمود اور فرزانہ بڑے بڑے منہ بیٹانے

لگے۔

-----☆☆☆-----

اٹلانٹس
پبلکیشنز

D-83 سائٹ۔ کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk